جنوری 2021ء

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

سرپرست اعلیٰ
وچیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

بیک وقت "انگریزی" اور "اُردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہانہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

www.YouTube.com/lahoreinternational

Your favourite Monthly Magazine

Lahore International is relaunching its YouTube Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to YouTube and check it out

ZINGMAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR

ھُوَالناصر — خدا تعالیٰ کے فضل و رحم کے ساتھ

بعد از خدا بعشقِ محمدؐ مخمرم — گر کفر ایں بود بخدا سخت کافرم

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلّہ

جلد نمبر: 6 شمارہ نمبر: 01 ربیع الثانی 1442 جنوری 2021ء

اس شمارہ میں

04 درسِ قرآن کریم

05 قوموں کی تباہی اور زوال کے اسباب

07 اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مشورہ: مجاہدِ اوّل و خلفِ آں سے مولانا شیرانی تک

09 مذہبی رہنماؤں کی سیاست

11 سقوط ڈھاکہ کا سیاہ ترین دن

13 بے رحم سیاست

15 کیسے کیسے انمول ہیرے لوگ

17 پاکستان کی ٹیسٹ کرکٹ میں انٹری: اور فضل محمود کو چھٹی دینے کے احکامات وزیراعظم ہاؤس سے براہ راست آئے

18 نئے زمانے کے شیخ چلی

20 جب پاکستانی بشیر ساربان بنے امریکی نائب صدر کے مہمان

22 چکوال پاکستان کے ایک گاؤں کا عبدالخالق عالمی ایتھلیٹ

24 میڈم نور جہاں کی زندگی پر ایک نظر: ملکہ ترنم کا خطاب کس نے دیا؟

26 پریس کلب کراچی کی چھپر چھایہ حمید چھاپرا کی رخصتی

27 بندہ ''جھلا'' ہے یا پھر ''کھوچل''؟

28 زہریلے دودھ کی زہریلی لسی ہی بنے گی

31 فرح پہلوی: کیا ہزاروں ڈالر مالیت کا ریشمی لباس ایران کی آخری ملکہ کا ہی ہے؟

32 جانوروں کی سمگلنگ سے متعلق پانچ عجیب و غریب واقعات

33 آغا خان: سر سلطان محمد سے شہزادہ کریم تک، اسماعیلی برادری کے خاندانِ اوّل کی دلچسپ تاریخ

36 انسانی حقوق کا چارٹر 1948: پاکستان کا کردار کیا تھا؟

37 ابراہام لنکن اور جوزف بائیڈن کا مشکلات بھرا سفر

40 کیا نوم چومسکی کی رائے پر غور ہوگا؟

42 کچھ ذکر نادر شاہ افشار کا!

46 عرب اسرائیل تعلقات کی خفیہ اور طویل داستان

48 ہٹلر کی دیوانی ساوِتری دیوی

52 نکاح کے ساتھ بھی۔ توبہ توبہ!

54 اسلام کا حقیقی تصور جہاد

57 شہداء ہی شہید ہوتے ہیں

58 ابن عربی کا روحانی فیضان

59 فارسی شعر و ادب کی تاریخ اور نمایاں شخصیات

زیر انتظام
عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

ایڈیٹر
منزہ خان

انچارج گوشہ ادب
مدثرہ عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ناروے)
+47-91698367

ظہیر الدین عباسی (جرمنی)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈا)
+41-6433112

عابد شمعون چاند (سعودی عرب)

ابن الامین (برطانیہ)
+44-7940077825

بلال طاہر (کراچی، پاکستان)
+92-3327051887

رحمت اللہ میر بلوچ (بیورو چیف بلوچستان)

محمد ثناء اللہ (بیورو چیف وسطی پنجاب)

چوہدری مقبول احمد (بھارت)
+91-9988489365

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤنڈ

website : lahoreinternational.com

اپنی تحریریں اور قیمتی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنیشنل آپ کا اپنا رسالہ ہے

اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیئے۔

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

درس قرآن کریم

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (سورۃ البقرۃ آیت:6-7)

ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر قائم ہیں اور یہی ہیں وہ جو فلاح پانے والے ہیں۔

(آیت نمبر 7) یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا (اس حال میں کہ) برابر ہے اُن پر خواہ تُو انہیں ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

تفسیر:

یہی لوگ (جن کا اُوپر ذکر ہوا) اپنے رب سے ہدایت پر ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو مظفّر و منصور ہوں گے۔ اس سے سابقہ آیات میں متّقی کی تعریف اور معنے بیان کر کے اب اللہ تعالیٰ نے بطور نتیجہ کے بتلا دیا کہ متقیوں کے لئے اس کتاب سے ہدایت پر ہونے کے یہ معنے ہیں کہ جب انسان ایمان بالغیب رکھ کر اور حقوقِ الٰہی اور حقوق العباد کو کماحقہٗ ادا کر کے اور خدا تعالیٰ کے کلیم ہونے پر ایمان لا کر اپنے اعمال کے نتائج اور ثمرات پر کامل یقین رکھتا ہے تو ہر ایک حجاب دُور ہو کر اس کو کامیابی نصیب ہوتی ہے اور متقی کے ہدایت پر ہونے کی یہ ایک دلیل بیان فرمائی ہے کہ اگر وہ کامیاب ہو جاویں تو پھر ان کی کامیابی ان کے راہِ راست پر ہونے کی دلیل ہے۔ دعوی کر کے دشمن پر ایک خاص غلبہ پانا ایک خاص نشان صداقت کا ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کی جماعت کو دیکھو اللہ تعالیٰ کا یہ کس قدر احسان ہے اور کیسا شُکر کا مقام ہے کہ ہم لوگوں کو اب ان باتوں کو سماعی طور پر نہیں ماننا پڑتا بلکہ خدا کے کرم و فضل سے ایک عَلٰی هُدًى اور مفلح وجود ہمارے زمانہ میں موجود ہے اور عرصہ بائیس سال سے جو کامیابی وہ دشمنوں پر حاصل کر رہا ہے وہ اس کے راہِ راست پر ہونے کی دلیل ہے اور یہی وہ منہاجِ نبوّت ہے جس کو دکھلاتا ہے اور کم بخت نادان دشمن نہیں دیکھتے۔ کامیابی یعنی امن، آرام اور سُکھ کی زندگی کے اسباب اور اس کے اصول اس میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرما کر اب آگے مغضوب علیہم گروہ کے حالات بیان کئے ہیں۔

آیت نمبر 7 کی تفسیر:

یہ غضب کُفر سے پیدا ہوتا ہے۔ پس فرماتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جن لوگوں نے کُفر اختیار کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے بطور جُملہ مُعترضہ اِس کی وجہ بیان فرمائی۔ جملہ مُعترضہ مبتدا اور خبر کے درمیان میں کئی وجوہات سے آتا ہے۔ ایک وجہ بیان کرنے کے لئے۔ چنانچہ یہاں اِسی لئے فرمایا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ برابر ہو گیا ہے ان پر تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا یعنی وہ کافر تیرے اِنذار اور عدمِ اِنذار کو مساوی سمجھتے ہیں۔ جب کسی کی نصیحت کا عدم و وجود برابر سمجھ لیا گیا تو پھر کچھ پرواہ نہ رہی۔ اِس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان نصیب نہیں ہوتا۔

تین مرضیں ہیں:

سب سے پہلے تو وہ جو بات کو سُنتا ہی نہیں۔ پہلے ہی سے انکار کر دیا۔ دوسرا وہ جس نے سُنا مگر اس کا سُننا نہ سُننے کے برابر ہے۔ تیسرا وہ جو نگاہ سے کام نہیں لیتا کہ نہ ماننے والوں کا کیا حشر ہو رہا ہے۔ کوئی بات ہو اس کو غور سے سُن لینا پھر فکر کرنا بہتر ہے کہ یہ میرے لئے برکت کا موجب ہے یا نقصان کا۔ پھر دیکھے کہ اس کے ماننے والے آرام میں ہیں یا نہیں اور اس کے نہ ماننے والوں کا انجام کیا ہو رہا ہے۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور تیرے اور تیرے اِنذار اور عدم اِنذار کو برابر جانا وہ مومن نہ بنیں گے۔ كَفَرُوْا یعنی اپنے اختیار سے کفر کیا۔ کفر کے معنی انکار، حق کو چُھپانا، ڈھانک دینا اور یہ سب باتیں انسانی اختیار میں ہیں۔

(حقائق الفرقان جلد اوّل صفحہ 68)

اداریہ

قوموں کی تباہی اور زوال کے اسباب

مدیر اعلیٰ محی الدین عباسی

جب کسی قوم میں بدعملی، بدخلقی اور ناانصافی اجتماعی طور پر آجائے تو تباہی و بربادی اس کا مقدر اور زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ جب ہم حیاتِ انسانی کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس کا رُخ اجتماعیت کی طرف ہی نظر آتا ہے اور جب وہ فطرت کے خلاف چلیں، قانونِ قدرت کو بُھلا دیں، نافرمانی و گستاخی کریں تو خدا تعالیٰ کے متعین کردہ اصولوں سے رُوگردانی اور انحراف کریں تو خدا تعالیٰ کی پکڑ میں آجاتے ہیں۔ قومیں اجتماعی طور پر بدعمل ہوجائیں تو اس کی سزا دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں مختلف قوموں کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔ جن میں یہ بُرائیاں پائی جاتی تھیں۔ درج ذیل چند آیات میں اس کا ذکر آیا ہے۔

ترجمہ! کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کردیں مزید یہ کہ اور ان کے بعد ہم نے دوسری قوموں کو پروان چڑھایا۔

(سورۃ الانعام:7)

ترجمہ! اور یقیناً ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی زمانوں کے لوگوں کو ہلاک کردیا تھا جب انہوں نے ظلم کئے حالانکہ ان کے پاس ان کے رسول کھلے کھلے نشانات لے کر آئے اور وہ ایسے تھے ہی نہیں کہ ایمان لے آتے۔ اسی طرح ہم مجرم قوم کو جزاء دیا کرتے ہیں۔ (سورۃ یونس:14)

ترجمہ! اور کتنی ہی نسلیں ہیں جنہیں ہم نے ان سے پہلے ہی ہلاک کردیا۔ کیا تُو ان میں سے کسی کو محسوس کرتا ہے یا اُن کی آہٹ سنتا ہے۔ (سورۃ مریم:99)

قرآنِ کریم کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ قدرت قوموں کے عروج و زوال اور تباہی و بربادی کے اصولوں کے اطلاق میں قوموں کے درمیان فرق نہیں کرتی۔ جو قوانین اور اصول یہود و نصاریٰ کے لئے ہیں وہی امتِ مسلمہ کے لئے ہیں اور جو ضابطے اہلِ کفر کے لئے ہیں وہی اہلِ ایمان کے لئے ہیں۔ قرآن کے اصول اٹل ہیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ اللہ کو ''سنۃ اللہ'' کہا گیا ہے۔

دیکھیں سورۃ احزاب کی آیت 63 میں ترجمہ! یہ اللہ کی سنت ان لوگوں کے متعلق بھی تھی جو پہلے گزر چکے ہیں اور تُو ہرگز اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔

آیئے ہم اب پاکستانی قوم میں پائی جانے والے ان عوامل اور اسباب کا ذکر کرتے ہیں جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ وہی برائیاں ہیں جو دوسری قوموں میں پائی گئی تھیں جو تباہ کردی گئی۔ پچھلی قوموں نے خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء اور ولیوں کی تذلیل اور ٹھٹھا کیا آج بھی وہی کچھ کیا جارہا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مسلسل کیا جارہا ہے اور جان بوجھ کر۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ 70 فیصد اَن پڑھ ہے بظاہر ان وجوہات کے باعث کئی قسم کی غلط فہمیاں ہمارے دماغوں میں راسخ ہوگئی ہیں۔ راقم الحروف ایک ادنیٰ سا طالبِ علم ہے قرآن کی تفاسیر اور سیرت کی کتابوں سے علم حاصل کرتا رہتا ہوں۔ جہاں کوئی بات سمجھ نہ آئے قرآنِ کریم کا مطالعہ احادیث اور تاریخ سے رہنمائی لے کر اپنی رائے قائم کرتا ہوں۔ اپنی کم علمی کے باوجود جس قسم کا تصورِ اسلام، مذہب ہم نے اپنے دماغوں میں بٹھا رکھا ہے اس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ تعلق نہیں۔ اصل میں یہ آسمانی آفات وباء ہمارے گناہوں، برائیوں کی خدا تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کیونکر معاف کرے گا۔

قرآنِ کریم میں لفظ ''امانت''، ''لازماً''، ''احتساب'' کے مضمون کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے جمہوری، ریاستی ادارے امانت کی اس ذمہ داری کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے وہ اپنے منتخب کرنے والوں کے سامنے جوابدہ ہیں جس نے ان کے سپرد اپنی امانت کی ہے۔ ان جمہوری معاشروں میں جہاں امانتیں ضائع ہو رہی ہیں ناانصافی اور ظلم کا الزام ایسے اداروں یا افراد پر ہوتا ہے جو بیک وقت بنی نوع انسان اور اللہ تعالیٰ دونوں سے کئے ہوئے عہدوں کو توڑ رہے ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی منتخب شدہ تنظیم یا فرد اپنی امانت کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کا لازمی نتیجہ مختلف معاشرتی برائیوں کی صورت میں برآمد ہوا کرتا ہے۔ جو آج ہم اس معاشرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ انسان عدل وانصاف پر قائم ہونے کی بجائے جبر واستبداد کا مقابلہ کرتے کرتے فنا ہو جاتا ہے۔ آج نہیں تو کل یہ ہمارے معاشرے میں پیش آنے والا ہے۔ لازماً ایسے واقعات کا سامنا اس قوم کو دیکھنا پڑے گا کیونکہ ہر کوئی اپنی مرضی کا قانون نافذ کرنا چاہتا ہے خدا تعالیٰ کے قانون اور اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے۔ قرآنِ کریم کے مطابق حکومت کے سیاسی نظام میں جمہوریت کو دیگر تمام نظاموں پر ترجیح دی گئی ہے۔ اس طرح قرآنِ کریم ہر قسم کی حکومت سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس احساس کو ہمیشہ مدِنظر رکھتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہے۔ قرآنِ کریم کی سورۃ النساء:59 میں فرمایا کہ ترجمہ! یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حقداروں کے سپرد کیا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان حکومت کرو تو انصاف کے ساتھ حکومت کرو۔ یقیناً بہت ہی عمدہ ہے جو اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بہت سننے والا اور گہری نظر رکھنے والا ہے۔

اس قوم ومعاشرہ میں کئی قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں ریاستی اداروں کا فرض ہے کہ وہ ان کی اصلاح کریں مثلاً ہم جتنے بھی گناہ کر لیں جائز، کسی بے گناہ کو قتل کر دیں، لوگوں کے ایمانوں پر ڈاکہ، عورتوں کی عزتیں لوٹنا، گردے نکال کر بیچ دینا، اقلیتوں کی عبادت گاہوں اور ان کی بستیوں کو آگ لگانا اور ان پر جھوٹے مقدمات قائم کرنا، رشوت ودھوکہ فراڈ، امانت میں خیانت کرنا، مدرسوں کے بچوں کے ساتھ زیادتی ظلم وتشدد اور ان کے ساتھ زنا کرنا، معصوم بچوں بچیوں کے ساتھ زیادتی کرنا، درگاہوں پر جانے والی عورتوں کو نشہ دے کر اغواء کرنا اور لاتعداد جرائم ہیں۔ اس قسم کے ہر غلط فعل کرنا اس معاشرہ میں راسخ ہو چکا ہے۔ پھر ان واقعات کے بعد کسی مولوی یا پیر سے تعویذ، ٹونہ، وظیفوں اور روحانی علاج کی مدد سے خیال کرنا کہ ہم جنت میں چلے جائیں گے۔ انہی وجوہات کی بناء پر یہ آسمانی عذاب قوم ومعاشرہ پر مسلسل آ رہے ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ کسی پیر فقیر، مولوی کی بجائے واحدہٗ لاشریک کے آگے سربسجود ہوں ورنہ پچھلی قوموں کی طرح یہ قوم بھی عبرت کا نشان بن جائے گی اسلامی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ کاش کہ ہماری قوم ان باتوں کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والی ہو۔

آیئے خدا تعالیٰ سے گڑگڑا کر توبہ کریں اور معافی مانگیں وہ جلدی مان جاتا ہے۔ قرآن میں کئی بار اس کا ذکر آیا ہے۔ وہ بہت رحم کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے اور وہ ماں سے کئی گنا بڑھ کر پیار کرنے والا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے خدا کو راضی کر لو کیونکہ ہم خدا کو ناراض کر بیٹھے ہیں۔ سال سے زائد عرصہ ہو چکا آسمانی آفت وباء (کرونا) نے ساری قوموں کو امتحان میں ڈال دیا ہے۔

آج ہر مذہبی لیڈر یہی کہہ رہا ہے کہ یہ عذابِ الٰہی ہے ہمارے گناہوں کے اعمال ہیں پاکستانی قوم نے تو مفتی طارق جمیل کی امامت میں توبہ استغفار کے لئے دعا بھی کروادی اور اس میں ساری قوم کو قصوروار ٹھہرا دیا۔ وہ خود بھی آج کل اس وباء میں مبتلاء ہو چکے ہیں اور اپنی بیماری کو لے کر پوری قوم سے التجاء کی ہے کہ یہ وباء اور بلا کی آفت ہے۔ اس سے بچیں۔ ساری دنیا میں کرونا وائرس سے اب تک متاثرین افراد کی تعداد 7 کروڑ ہے اور اموات 16 لاکھ سے زائد ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے کئی اور قسمیں نمودار ہو رہی ہیں اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اب اس کی آگے چل کر کیا صورتحال ہوگی۔ اس ضمن میں تمام انسانوں کو چاہئے قرآنی تعلیمات اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے وقت کے امام کی طرف رجوع کریں تاکہ اللہ آپ سے راضی ہو اور تمام آفات سے ہمیں پاک کر دے۔ آمین

اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مشورہ: مجاہدِ اوّل و خلفِ آں سے مولانا شیرانی تک

تحریر: طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

ابھی متعدد عرب ممالک کی طرف سے اسرائیل کو باضابطہ طور پر تسلیم کرنے کی خبریں سننے کے پے در پے "صدمات" کا سلسلہ کم نہ ہوا تھا کہ پاکستانی وزیر خارجہ محترم شاہ محمود قریشی صاحب کا عرب امارات کی طرف سے حاضری کا حکمنامہ موصول ہوا، دل دھڑک اٹھے کہ واپسی پر شاہ صاحب پاکستان کی طرف سے بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کا فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے پاکستانی عوام کو اعتماد میں لینے کا کوئی بیان جاری فرمائیں گے (اصل "امہ" تو اسرائیل کو تسلیم کر ہی چکی) لیکن انہوں نے یہی کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ امارات کی طرف سے اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو معمول کے مطابق ڈھالنے کی وجہ جاننے اور سمجھنے کے لئے وہاں تشریف لے گئے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر "دوسری" یا "اصل" بات کے لئے راہ ہموار کرنے کا مذہبی اور شرعی فریضہ بزرگ مذہبی شخصیت حضرت مولانا محمد خان شیرانی صاحب سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کو سونپ دیا گیا تھا۔ چنانچہ ایک حالیہ مجلس سوال وجواب میں باقاعدہ کسی صاحب کی طرف سے یہ سوال پوچھا (یا پچھوایا) گیا کہ آج کل اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارہ میں باتیں چل رہی ہیں، تو کیا فرماتے ہیں آپ حضور بیچ اس مسئلہ کے۔ سوال سن کر نہ آپ کے چہرہ مبارک پہ غیض وغضب کے تاثرات نمودار ہوئے، نہ جوش جہاد سے آپ کا چہرہ سرخ ہوا اور نہ ہی آپ نے سوال کنندہ کو یہود اور اسرائیل کا ایجنٹ، یا "قادیانی" قرار دیتے ہوئے اپنے معتقدین کو اپنی ابرو مبارک کی جنبش سے اس شخص کو اٹھا کر مجلس سے باہر پھنکوا دینے کا اشارہ دیا۔ اس کے برعکس بالکل "نارمل" رہتے ہوئے اور کامل متانت و سنجیدگی کے ساتھ جو جواب آپ نے ارشاد فرمایا، معلوم ہوتا ہے کہ سوال کی طرح جواب بھی پہلے سے خوب اچھی طرح سے تیار کیا ہوا تھا۔ یہ کوئی بدظنی نہیں بلکہ جناب کا لب ولہجہ اور "ٹون" اس کی پوری غمازی کر رہی تھی۔ ویسے بھی آپ موصوف اس پایہ کے عالم ہیں اور عمر کے اس حصہ میں ہیں جہاں کسی سوال کا جواب دینے کے لئے کوئی تیاری کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، ہاں "ٹائمنگ" کی منصوبہ بندی کی ضرورت ضرور پیش آسکتی ہے۔ احقر کے نزدیک آپ کے جواب کے دو بنیادی نکات تھے۔ ایک کا تعلق عالمی سیاست اور تزویراتی حکمت عملی سے تھا اور دوسرے کا تعلق فقہی، اسلامی یا شرعی لحاظ سے تھا۔ اول الذکر کے حوالے سے تو آپ نے یہ فرمایا کہ اس وقت کی عالمی اور بین الاقوامی صورتحال جو چل رہی ہے، اسرائیل کے وجود کو اس کا رسمی حق عطا کرنا، یعنی اسے تسلیم کر لینا ان کے نزدیک ضروری ہو چکا ہے۔ کیونکہ یہ معاملہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اسے اسی طرح سے لینا چاہیئے۔

اسلامی وقرآنی نکتہ نظر سے اگر بات کی جائے تو اس حوالہ سے مولانا صاحب موصوف نے سورۃ المائدہ کی مندرجہ ذیل آیت بطور حوالہ ودلیل پیش فرمائی:

يَا قَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ

سورہ مائدہ کی اس آیت میں یہ ذکر کیا گیا ہے (جو بعض تراجم کے لحاظ سے 21 ویں اور بعض کے مطابق 22 ویں ہے) کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر بنی اسرائیل سے یہ کہا کہ اے میری قوم "ارض مقدس" میں داخل ہو جاؤ جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ مولانا شیرانی صاحب نے زیر لب مسکراتے ہوئے فرمایا کہ مولویوں کو چاہیئے کہ ذرا کتب اللہ کے الفاظ پر غور کریں کہ اس کے کیا معنی ہیں؟۔

آپ نے فرمایا کہ باقی سب بحثیں "فالتو" ہیں، ان کی ضرورت نہیں۔

مراد یہ تھی کہ ارض مقدس کو تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف قوم یہود کے نام کر دیا گیا ہے ہم کون ہوتے ہیں ان کا یہ حق نہ تسلیم کرنے والے۔ مولانا صاحب کی یہ مجلس سوال پشتو زبان میں تھی، اس کے مذکورہ حصہ کے تراجم ملکی وغیر ملکی (بشمول اسرائیلی) اخبارات نیز سوشل میڈیا میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔

قارئین کرام مولانا شیرانی صاحب کے ان بظاہر قوی دلائل کو سن کر مجھے نجانے کیوں مجاہد اول صاحبزادہ عبدالقیوم خان صاحب مرحوم سابق صدر آزاد کشمیر کی یاد آ گئی۔ آپ ہمیشہ اس خیال کے حامی رہے اور ببانگ دہل یہ مطالبہ بھی کرتے رہے کہ پاکستان کی طرف سے اسرائیل کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لینا چاہیئے۔ آپ کے صاحبزادہ محترم سردار محمد عتیق خان صاحب بھی جنرل پرویز مشرف کے دور حکومت میں اسی نظریہ کی ترویج کرتے رہے اور اپنے ایک شائع شدہ انٹرویو کے مطابق اب بھی اسی خیال کے حامی ہیں، تاہم فی الحال اس حساس نوعیت کے مطالبہ کا اعادہ کرنے کی "ٹائمنگ" کا مسئلہ پیش آیا ہوا ہے۔ مجاہد اول محترم سردار عبدالقیوم صاحب کے بارہ میں اکثر یہ سننے میں آتا تھا کہ آپ نے خفیہ طور پر اسرائیل کا دورہ بھی کیا تھا جس کی آپ ہمیشہ نفی کرتے

رہے۔تاہم اسکے باوجود وہ اسرائیل کوتسلیم کرنے کے بیان پر تادم حیات قائم رہے تھے۔آپ کا اس بارہ میں نقطہ نظر کیا تھا،اس کا ذکر کرتے ہوئے محمد عبدالمتین خان زاہد (المعروف ابوعمار زاہدالراشدی) صاحب تحریر فرماتے ہیں:

محترم سردار عبدالقیوم خان کی اس وضاحت سے مجھے اتفاق ہے کہ وہ یقیناً اسرائیل نہیں گئے ہوں گے، اس لیے کہ ان جیسا جہاندیدہ اور تجربہ کار بزرگ کسی طرح بھی ایسے رسک کا متحمل نہیں ہوسکتا، البتہ سردار صاحب محترم نے اس وضاحت کے ساتھ اسرائیل کو ایک حقیقت قرار دیتے ہوئے اسے تسلیم کر لینے کا جو مشورہ دیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔سردار محمد عبدالقیوم خان صاحب کا ارشاد ہے کہ

1. بھارت کے ساتھ حالت جنگ کے باوجود سفارتی تعلقات قائم ہیں تو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے میں کیا حرج ہے؟

2. دوسری بات انہوں نے یہ فرمائی کہ اسرائیل ایک حقیقت ہے اس لیے اسے تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

3. اس حوالے سے ان کا تیسرا ارشاد یہ ہے کہ اسرائیل کے ساتھ ہمارا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔

zahidrashdi.org/821//:http

جہاں تک مجاہد اول کے صاحبزادہ سردار عتیق احمد خان صاحب کا تعلق ہے تو ان کے بارہ میں معروف کالم نگار سحر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

ایک زمانے میں آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم اور مسلم کانفرنس کے قائد سردار عتیق احمد خان نے پشاور بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران اسرائیل کو تسلیم کرنے بارے آواز بلند کی تھی۔موصوف نے اس حوالے سے دلائل دیئے ان کا خلاصہ تھا کہ قیام پاکستان کے وقت بھارت میں ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ جبکہ عورتوں کو اغوا اور بے آبرو کیا گیا، اب تک اس کے ساتھ ہمارے چار بڑے عسکری تصادم ہو چکے ہیں، نئی دہلی نے ہمارے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کر دیا، وہ ہمارے کشمیر پر بھی قابض ہے، بھارت اور پاکستان کی روایتی دشمنی سے ساری دنیا واقف ہے لیکن اس کے باوجود پاکستان نے بھارت کو تسلیم کر رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔اس کے مقابلے میں اسرائیل نے پاکستان کے ساتھ مذکورہ زیادتیوں میں سے کسی ایک زیادتی کا ارتکاب نہیں کیا لیکن ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کے نتیجہ میں ہمارا رابطہ کسی سطح پر اس اسرائیلی اور یہودی لابی کے ساتھ نہیں ہے جو حقیقی معنوں میں اور عملی طور پر بین الاقوامی سیاست، معیشت، میڈیا اور سفارت کاری پر اپنا نتیجہ خیز اثر ورسوخ رکھتی ہے۔

بحوالہ: https//:urdu.alarabiya.net/ur/politics/2015/12/08

یہ جو سردار عبدالقیوم صاحب کے کسی مبینہ دورہ اسرائیل کا تعلق ہے، قیام اسرائیل کے بعد انہوں نے وہاں کا دورہ کیا تھا یا نہیں یہ حقیقت تو ہمیں نہیں معلوم، اگر آپ اس سے انکار کرتے رہے تو پھر ان پر اعتبار نہ کرنے کا کوئی جواز تو نہیں بنتا۔لیکن یہ حقیقت تو بہر حال ناقابل تردید ہے کہ اسرائیل کو انہوں نے عین اپنی آنکھوں تلے بنتے ضرور دیکھا تھا۔یہ اس زمانے کی بات ہے جب ارض فلسطین برٹش مینڈیٹ کی عملداری میں تھی اور صیہونی مملکت اسرائیل کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی۔سردار صاحب موصوف بھی برٹش آرمی میں ملازم تھے اور ان دنوں ارض فلسطین میں ان کی پوسٹنگ تھی۔اس وقت کے حالات میں یہودی آبادکاروں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی آنکھوں دیکھا حال آپ نے دسمبر 1973 میں چنیوٹ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا:

میں نے دیکھا کہ انہوں (یہودیوں) نے کس طرح اپنی بچیوں کو وقف کر رکھا تھا۔1950 سے پہلے وہاں (فلسطین میں) مجھے رہنے کا موقعہ ملا تھا کہ کس طرح وہ اپنی خوبصورت اور نوجوان بچیوں کو وقف کر رہے تھے تاکہ وہ عرب لڑکوں کے پیچھے پھریں اور ان کو آوارہ کریں اور پھر ان کی جائیدادوں پر قبضہ کر لیں اور یہ فلسطین جس کا جھگڑا آپ کر رہے ہیں، یعنی ایک تو وہ فلسطین ہے جو پہلے یہودیوں کے پاس تھا، میں اس کی بات کر رہا ہوں۔یہ تو بعد میں انہوں نے حملے وغیرہ کر کے کچھ اور علاقہ لیا ہے۔تو پہلے یہودیوں نے وہ خریدا تھا، اسی طریقہ سے، اور میرے سامنے انہوں نے خریدا ہے۔اور خریدا اس طرح کہ عرب لڑکے کے پیچھے اپنی بیٹی لگا دی، اس نے عیاشی کر کے باپ کی دولت لٹا دی اور اسی یہودی کا پھر مقروض ہو گیا جس نے بعد میں وہ باغ خرید لیا، یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ (ہفت روزہ لولاک 26 فروری 1974)

قارئین کرام شاید آپ میں سے کسی کے ذہن میں یہ سوال جنم لے کہ یہ سب کچھ اس مجاہد اول کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا لیکن آپ نے نہ کسی فلسطینی نوجوان کو یہودیوں کی ان چالوں سے ہوشیار رہنے کی نصیحت کی، نہ ہی اس کے باپ کو متنبہ کیا کہ تمہارا بیٹا میری آنکھوں کے سامنے ایک یہودی حسینہ کے جھانسے میں آکر تمہاری عمر بھر کی پونجی لٹا رہا ہے اور نتیجہ کیا نکلے گا، تم اپنے خاندان سمیت اپنی آبائی زمین سے بے دخل کر دیئے جاؤ گے اور یہودی آبادکاروں کو ان کی ارض موعود کا ایک اور ٹکڑا ہاتھ آجائے گا۔لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، نہ ہی مسلم امہ کو اس بارہ میں کوئی کتاب لکھ کر یا بیان جاری کر کے خبردار کیا۔اس کا واحد سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ مولانا شیرانی صاحب کی طرح "كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ" کے معنی سے خوب آگاہ تھے!۔

مذہبی رہنماؤں کی سیاست

تحریر: شکیل نواز

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اس کی سیاست میں غیر سیاسی قوتوں کا عمل دخل رہا ہے۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ عمل دخل بڑھتا ہی گیا۔ پاکستانی سیاست میں ان غیر سیاسی قوتوں کے کردار کی واضح مثال آپ کو آئی جے آئی اور اصغر خان کیس کی شکل میں ملتی ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام تر سیاستدانوں نے ان غیر سیاسی قوتوں سے مدد لی ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں بننے والی تمام تر سیاسی حکومتوں کو ان غیر سیاسی قوتوں کی مدد و تائید حاصل رہی ہے تو غلط نہ ہوگا، قابل شرم بات یہ ہے کہ ہمارے تقریباً تمام لیڈران ان غیر سیاسی قوتوں کی آشیر آباد سے ہی سیاست میں آئے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک ان ستر سالوں میں مخلص قیادت نہیں ملی۔ ان ستر سالوں کا زیادہ تر حصہ تو مارشل لا کی نظر ہو گیا۔ اگر کسی نے مخلصانہ جذبے سے کام کرنا چاہا بھی تو نااہل اور کرپٹ نظام نے انہیں کام نہیں کرنے دیا۔ ان غیر سیاسی قوتوں کے حمایت یافتہ سیاستدانوں کی وجہ سے سیاست زبوں حالی کا شکار تھی اور یہ کفیت آج بھی برقرار ہے۔ یہ غیر سیاسی قوتیں مختلف اوقات میں مختلف سیاسی پارٹیوں کو سپورٹ کرتی رہی ہیں۔ اگر برسر اقتدار پارٹی ان کے مفادات کے خلاف جائے تو یہ اپنا وزن دوسری سیاسی پارٹی کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں۔ مسلم لیگ ن اور تحریک انصاف کے عروج میں بھی انہی قوتوں کا ہاتھ نظر آئے گا۔ حکومتوں کو گرانے اور بنانے میں ان غیر سیاسی قوتوں کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ تحریک انصاف کے عروج سے پہلے نوجوان پاکستانی سیاست میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، تحریک انصاف کے بننے کے چند سالوں بعد نوجوانوں کو عمران خان اور تحریک انصاف کی صورت میں امید کی کرن نظر آنے لگی اور نوجوان عملی سیاست میں بھی آنے لگے۔ ملک کے لئے فکر مند اور ملک کا درد رکھنے والا یہ نوجوان طبقہ تحریک انصاف کی سپورٹ کرنے لگا۔ 2013 کے الیکشن میں اس نومولود سیاسی پارٹی کا دوسرے نمبر پر آنا نوجوان نسل کی سپورٹ کا واضح ثبوت ہے۔ تحریک انصاف کی کارکردگی اور کرپشن کے خلاف ان کا مؤقف بہت واضح ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے یہ غیر سیاسی قوتیں تحریک انصاف کا متبادل تلاش کرتی نظر آ رہی ہیں۔ اور اس سلسلے میں دو جماعتوں کو باقاعدہ این اے 120 کے الیکشن میں آزمایا گیا ہے ان دو جماعتوں میں ملی مسلم لیگ اور تحریک لبیک شامل ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ دو جماعتیں، جماعت اسلامی جیسی پرانی اور تجربہ کار سیاسی پارٹی کو بھی پیچھے چھوڑ گئیں ہیں۔ ان کو کاسٹ ہونے والے ٹوٹل ووٹ سے ہی آپ کو ان کی بیک سپورٹ کا اندازہ ہو جائے گا۔ ان دونوں جماعتوں کے پاس نہ کوئی منشور ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل، تحریک لبیک ممتاز قادری کی شہادت کو کیش کروا کر ووٹ لینا چاہتی ہے اور ملی مسلم لیگ بھارت مخالف ایجنڈا لے کر فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔

غیر سیاسی قوتیں ان نام نہاد جماعتوں کو سیاسی عمل میں لا کر ایک سنگین غلطی کرنے جا رہی ہیں جو کہ ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔ ذرا سوچیئے جو مذہبی رہنما اپنے مخالفین کو مذہبی معاملات میں گالم گلوچ کے علاوہ بات ہی نہ کرے اور کسی کے اختلاف رائے کو برداشت ہی نہ کر سکتا ہو، اُس کی سیاسی بصیرت کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔ ایسے لوگوں کو سیاست میں لانا فرقہ واریت کو ہوا دینے کے مترادف ہے۔ اور ملک عزیز اس وقت کسی بھی قسم کے اندرونی خلفشار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ خاص کر جب بات مذہب کی ہو تو لوگوں کے جذبات کنٹرول کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تحریک لبیک اقتدار میں آ کر کس سے بدلہ لینا چاہتی ہے، حضور اگر آپ نے بدلہ لینا ہے تو اس کے لیے

مناسب فورم عدلیہ ہے وہاں کیس دائر کیجئے اور اگر وہاں آپ کی نہیں سنی جاتی تو دوسرا راستہ پُرامن احتجاج کا ہے۔ حضور والا آپ اقتدار میں آ کر بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ معاف کیجئے گا پھر آپ کو بدلہ نہیں صرف اقتدار ہی چاہیے۔ آپ رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیجئے کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو اس لب و لہجے میں جواب دیا؟ لہذا اپنا یہ قصاصی منجن بند کیجئے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے جاری کردہ کالعدم تحاریک کی فہرست میں شامل ہونے اور پھر مختلف ناموں سے کام کرنے والی ایک تنظیم سے ملی مسلم لیگ نکالی جا رہی ہے۔ اس تنظیم کا نعرہ صرف بھارت اور امریکہ کی تباہی اور بربادی ہے۔ ایسی تنظیموں کو سیاست کی اجازت دے کر ہم دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ ہم خود ایسی تنظیموں کی سرپرستی کرتے ہیں؟ ملی مسلم لیگ سے میں کہنا چاہوں گا کہ مسئلے کا حل اس مسئلے کی وجہ بننے والے کی تباہی و بربادی کبھی نہیں ہوسکتا، ہمیں پہلے اپنا آپ درست کرنا ہوگا۔ میرے نزدیک آپ بطور ایک فلاحی ادارہ اچھا کام کر رہے ہیں اس پر آپ قابل تعریف ہیں لیکن اس کے باوجود بھی آپ کی فلاحی تنظیم واچ لسٹ پر ہے۔ مہربانی فرمائیں اپنی فلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں اور ملک کی بدنامی کا باعث مت بنیں۔ میں ان دونوں پارٹیوں سے گزارش کرنا چاہوں گا کہ فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات سائیڈ پر رکھ کر لوگوں کی دینی معاملات میں تعلیم و تربیت کی ناگفتہ بہ حالت پر غور کیجئے۔ ہم نام کے مسلمان رہ گئے ہیں ہماری اخلاقی و دینی تربیت آپ علما کرام کا فرض ہے۔ آپ اپنا اصل کام کیجئے فرقہ واریت چھوڑ کر لوگوں کو دین کا علم دین کی روح کے مطابق دیجئے، یہ افضل ترین جہاد ہے۔ یہی کام ہماری آنے والی نسلوں پر احسان ہوگا۔ اسی سے آپ بروز قیامت اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے سامنے سرخرو ہوں گے۔ آخر میں میری ان غیر سیاسی قوتوں سے گزارش ہے کہ آپ بے شک ان معاملات کو بہتر جانتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ کچھ پالیساں وقتی طور پر فائدہ مند ہوتی ہیں مگر یہ بعد میں بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہیں اس کی واضح مثال افغان جہاد کی ہے۔ افغان جہاد کی پالیسی وقت کے لحاظ سے بہت ضروری تھی مگر بعد میں اس پالیسی کے لحاظ سے پلاننگ نہیں کی گئی یا اس پالیسی کا مناسب خاتمہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ہمارے لئے ستر ہزار جانوں اور اربوں ڈالر کے ضیاع کا باعث بنی۔ مذہبی رہنماؤں کو سیاسی میدان میں لانے سے فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات و تعصبات میں خطرناک اضافہ ہوگا، اور یہ امر آنے والے دنوں میں قومی یکجہتی کو شدید خطرات سے دوچار کر دے گا۔

❁❁❁

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تمناؤں کی بدولت ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور انٹرنیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ جو جدید تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ آپ کی تجاویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ" پُر عزم ہے۔

ویب سائٹ پر اُردو اور انگریزی دونوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیائے صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد "ہفتہ وار" کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(ادارہ لاہور انٹرنیشنل)

Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl

Twitter: @lahoreintl

Facebook: lahoreinternational

YouTube: lahoreinternational

Google+: lahoreintl

Contact: +447940077825

Whatsapp: +447940077825

Email: lahoreintlondon@gmail.com

سقوط ڈھاکہ کا سیاہ ترین دن

تحریر: زین سہیل وارثی

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

دسمبر کے مہینہ میں عجیب غم کا احساس ہوتا ہے، موسم کی شدت اپنی جگہ پر لیکن ہم پر تو اس مہینہ دو ایسے سانحہ گزرے ہیں کہ دل خون کے آنسو روتا ہے، پہلے سقوط ڈھاکہ اور پھر سانحہ اے پی ایس جو 2014 میں رونما ہوا۔ فیض احمد فیض، نصیر ترابی اور حبیب جالب جیسے شعرا نے شاعری کے ذریعے قوم کا درد بانٹا اور سقوط ڈھاکہ کے سانحہ کو بیان کرتے رہے۔ جالب چونکہ عوامی شاعر تھے اس لئے انھوں نے لگی لپٹی بات نہیں کی، کھل کے بات کی اور فرمایا کہ راستہ کٹ رہا ہے اور منزل کھوئی جا رہی ہے اور حکمران چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

(از فیض احمد فیض)

بنگلہ دیش کی جنگ آزادی، جسے بنگالی میں مکتی جدھو اور پاکستان میں سقوط ڈھاکہ کہا جاتا ہے، پاکستان اس سانحہ کے نتیجہ میں دولخت ہو گیا اور مشرقی پاکستان آزاد ہو کر بنگلہ دیش کی صورت میں دنیا کے نقشے پر ابھرا۔ اس جنگ کا باقاعدہ آغاز 26 مارچ 1971ء کو مسلح گوریلوں کے خلاف پاک فوج کے عسکری آپریشن سے ہوا جس میں باغی گروہ اور تربیت یافتہ فوجی جنھیں مجموعی طور پر مکتی باہنی کہا جاتا تھا، کے خلاف عسکری کارروائیاں شروع کیں۔ کیونکہ اندرونی طور پر ہم کافی حد تک کمزور تھے، ہمارے ازلی دشمن بھارت نے مکتی باہنی اور دیگر گروہوں کو عسکری، مالی اور سفارتی مدد فراہم کی جس کا برملا اعتراف حالیہ دنوں میں وزیر اعظم نریندر مودی نے کیا ہے، بالآخر 16 دسمبر

1971ء کو بھارت پاکستان کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پاکستان کی حدود میں گھس کر اس نے 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ میں افواج پاکستان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ یہ جنگ عظیم دوم کے بعد جنگی قیدیوں کی تعداد کے لحاظ سے ہتھیار ڈالنے کا سب سے بڑا موقع تھا۔ بنگلہ دیش کے قیام کے نتیجے میں پاکستان رقبے اور آبادی دونوں کے لحاظ سے بلاد اسلامیہ کی سب سے بڑی ریاست کے اعزاز سے بھی محروم ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب جاننے کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن تشکیل دیا گیا جس نے کمیشن رپورٹ تیار کی جو سرکاری سطح پر کبھی جاری نہ ہو سکی، نیز جو رپورٹ خفیہ طور پر ذرائع ابلاغ کے ہاتھ میں بھی آئی، اس میں سے بھی کئی اسباب حذف کر دیئے گئے۔ قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد سیاسی خلا پر نہ ہو سکا، نیز قائد ملت کی شہادت نے اس خلا کو مزید وسعت دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی ادارے مضبوط نہ ہو سکے۔ پہلے اختلاف کی بنیاد اردو زبان کو ترجیح دے کر ڈالی گئی جس کی تپش یا حدت 1952 تک اتنی ہو چکی تھی کہ تمام افراد نے اس آگ میں اپنے ہاتھ گرم کئے۔ جلتی پر تیل کا کام 12 مارچ 1949ء کی قرارداد مقاصد نے کیا جسے اس وقت منظور کروایا گیا جب مشرقی پاکستان کے ممبران، دستور ساز اسمبلی میں کم تعداد میں موجود تھے۔ 1956 کے آئین نے اس آگ پر پانی ڈالنے کی کوشش کی مگر 1958 میں لگائے گئے مارشل لاء سے یہ امید ختم ہو گئی۔ اس زمانے تک فوج میں سینئیر رینک میں صرف دو بنگالی افسر تھے ایک کرنل اور ایک میجر جرنل، لہذا سیاسی شعور رکھنے والے بنگالیوں نے سوچا کہ اقتدار تو کبھی عوام کو منتقل نہیں کیا جائے گا یہ انہی لوگوں کے پاس رہے گا جو طاقت کا سرچشمہ ہیں۔

11 دسمبر 1954ء کو سندھ اسمبلی سے ون یونٹ کی قرارداد پاس کروائی گئی، ون یونٹ قائم کرنے کا بنیادی مقصد بھی مشرقی پاکستان کے ووٹوں کے تناسب کو مغربی پاکستان کے برابر لانا تھا، بات یہاں ہی ختم نہ ہوئی، احساس محرومی کو مغربی پاکستان کی نوکر شاہی

اور مقتدر قوتوں نے بڑھاوا دینے کے لئے سیاسی کارکنان کا استحصال کیا، کبھی ایبڈو اور پروڈا کے قوانین لاکر سیاسی لوگوں کو نااہل کیا گیا۔ عدلیہ نے نظریہ ضرورت والا کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان کے ہر ضلع کا ڈی سی اور ایس پی مغربی پاکستان سے جاتا تھا تاکہ رعایا کو سدھایا جاسکے۔ مادر ملت فاطمہ جناحؒ کی صورت میں جو جمہوریت کی شمع روشن ہوئی تو مشرقی پاکستان ان کے ساتھ کھڑا نظر آیا مگر انتخابی نتائج کو بذریعہ سیاسی رشوت تبدیل کر کے ایوب خان کے حق میں کر لیا گیا۔ جو مشرقی پاکستان کی جمہوری قوتوں اور عوام کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بنگال سے تعلق رکھنے والے سپیکر قومی اسمبلی مولوی تمیز الدین کے ساتھ بھی ہتک آمیز سلوک کے واقعے نے بھی دلوں میں دراڑ ڈال دی۔ اس کے بعد 1965ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کی عوام نے دیکھا کہ ساری قوت مغربی محاذ کی حفاظت پر مامور ہے، وجہ یہ بتائی کہ مغربی محاذ سے دباؤ بڑھا کر مشرقی حصے کا دفاع ہوگا۔ اس حکمت عملی کے سبب بنگالی عدم تحفظ کا شکار ہوئے۔ پھر شیخ مجیب الرحمن کو اگرتلہ سازش کے تحت گرفتار کیا گیا مگر عدلیہ سے فیصلہ نہ لیا گیا۔ 1969ء میں ایوب خان نے بیماری کے سبب صدارت چھوڑی تو قانون کے مطابق قائم مقام صدر سپیکر قومی اسمبلی کو ہونا چاہیے تھا مگر سپیکر عبدالجبار خان جو بنگالی تھے، کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا۔ اقتدار ایک دوسرے جرنیل کو منتقل کر دیا گیا کیونکہ مقتدر حلقوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اگر اختیار بنگالی لوگوں کے حوالے کیا تو یہ تمام بساط سیاسی انداز میں چلانا شروع کر دیں گے۔ مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں 95٪ ہندو اساتذہ تھے جو دو قومی نظریہ کو نیست و نابود کرنے کے لئے برسرپیکار رہے۔ مغربی حصے کی جانب سے روا ناانصافیوں اور بدفعلیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے جس سے نئی نسل کے جذبات بڑھکانے اور طیش دلانے کے کام آتے۔

پٹ سن کی برآمدات کو مالیاتی طور پر ناانصافی کے طور پر پیش کرنا اور کہنا تمام تر ترقیاتی منصوبوں پر کام مغربی پاکستان میں ہوتا ہے۔ دروغ بہ گردن راوی، اسلام آباد جو اس وقت زیر تعمیر تھا، کی سڑکوں سے بنگالیوں کو پٹ سن کی بو آتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں زیادہ ترقی اس بنیاد پر بھی نہ کی گئی کہ ہر سال وہاں سمندری طوفان یا سیلاب آجایا کرتے تھے جس سے ڈویلپمنٹ کا کوئی خاطر خواہ فائدہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ میڈیا بھی سرکاری گرفت میں تھا جو عوام پر ہونے والی زیادتیوں پر تبصرے سے گریز کرتا۔ ملک مذہب کی بنیاد پر حاصل ہوا مگر مغربی پاکستان کی افسر شاہی بنگالیوں سے ہتک آمیز سلوک کرتی۔ اسلامی رواداری اور بھائی چارہ کسی سطح پر نظر نہ آیا۔ انہی رویوں کے خلاف شیخ مجیب نے مشہور زمانہ چھ نکات پیش کئے۔ ان نکات کی بنیاد پر مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی 1970ء کے انتخابات سے قبل شیخ مجیب الرحمن کے حق میں بلامشروط بیٹھ گئے جس نے شیخ مجیب الرحمن کو بنگالی قوم کا واحد لیڈر بنا دیا۔ 1970ء کے عام انتخابات کے نتائج کے مطابق عوامی لیگ نے 300 میں سے 160 نشستوں پر فتح حاصل کی تھی، اصولاً اسمبلی کا اجلاس بلا کر انھیں حکومت سازی کا موقع دینا چاہیے تھا کیونکہ 1970ء میں ہونے والے عام انتخابات اور ان کے نتائج کو تمام پارٹیوں نے تسلیم کیا۔ مگر یحییٰ خان اور بھٹو صاحب کی ہوس اقتدار نے معاملات سلجھنے نہ دیئے بلکہ ان کو بڑھاوا دیا۔ بھٹو صاحب کا رویہ بڑا جارحانہ تھا وہ حصول اقتدار کے لئے بیتاب و بے قرار تھے۔ آج کا پاکستانی پوچھتا ہے کہ 1970ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں اپنے امیدوار کھڑے کیوں نہیں کئے۔ "جو مشرقی پاکستان جائے گا یک طرفہ ٹکٹ لیکر جائے"، "اپوزیشن میں نہیں بیٹھوں گا"، "دونوں حصوں کے لئے علیحدہ آئین بنالیں"، "میرے ہاتھ میں سندھ اور پنجاب کی چابیاں ہیں، ان کے بغیر کوئی اقتدار نہیں حاصل کر سکتا" وغیرہ وغیرہ جیسے بیانات کیوں دیئے گئے۔ شیخ مجیب کی اکثریتی پارٹی کو اقتدار کیوں نہیں سونپا گیا، قائد عوام بھٹو صاحب نے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بن کر پولینڈ والی قرارداد میں سفارتی آداب کو ملحوظ خاطر کیوں نہ رکھا، کیوں نہیں اس قرارداد کو قبول کیا جس میں جنگ بندی کے امکانات تھے۔ جب بھی مشرقی پاکستان کا ذکر ہوگا یہ سوال قائد عوام اور پیپلز پارٹی کا پیچھا کریں گے؟

مشرقی پاکستان جو سیاسی طور پر مغربی پاکستان سے پختہ ذہن کا مالک تھا، جس نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی تھی، اس کی بیشتر قیادت متوسط طبقہ پر مشتمل تھی اور زیادہ تر کا رجحان سرخ انقلاب کی جانب تھا۔ جب کہ مغربی پاکستان میں تو وڈیروں اور جاگیرداروں کا قبضہ جو خوفزدہ تھے، مقتدر قوتوں کی طرح کہ دونوں بازو یکجا ہو رہے تو شیخ مجیب الرحمن کو اقتدار ملے گا اور وہ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کر دے گا اور غریب حساب مانگے گا، اس اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لئے جو مقتدر قوتوں اور جاگیرداروں نے مل کر بنائی تھی، اس کی بقا کی خاطر ملک قربان کر دیا اور تقسیم کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو اس سانحہ کے ذمہ دار ہیں لوگ یحییٰ خان کو بھول جاتے ہیں، جو نا صرف فوج کے سربراہ تھے بلکہ صدر مملکت بھی تھے اور ان دونوں سے زیادہ طاقتور تھے۔ شیخ مجیب الرحمن کی عوامی لیگ اکثریتی پارٹی بن کر سامنے آئی جس کو اقتدار منتقل نہ ہوسکا۔ اس کا سبب بے اعتمادی، نااتفاقی اور جمہوریت کش پالیسی کے سبب تھا لہٰذا قیادت کی ناکامی بین الاقوامی سازش بھارتی جارحیت اور مشرقی پاکستان کے باسیوں کی محرومی نے مملکت خداداد کو دولخت کر ڈالا۔ قائداعظم محمد علی جناح کا پاکستان 16 دسمبر 1971ء کو آدھا رہ گیا۔ سقوط ڈھاکہ کا المیہ ہمیں سبق دیتا ہے کہ جب آپ اندرونی طور پر خلفشار کا شکار ہوں، اور معاشی طور پر کمزور ہوں، نیز ملک میں سیاسی استحکام نا ہو تو دشمن فائدہ بھی اٹھائے گا اور آپ کی قلعہ کی طرح کی دیواروں پر بھی لوگ نقب لگالیں گے اور بالآخر آپ کا گھر مٹی کا گھروندا ثابت ہو گا، حقوق و فرائض بانٹنے سے ملک مضبوط ہوتے ہیں کمزور نہیں، نیز ملک دستور اور عوامی حق رائے دہی پر چلتے ہیں نا کہ ذاتی خواہشات پر معاملات کو چلایا جاسکتا ہے۔

نوٹ: ادارے کا قلمکار کے خیالات اور پیش کردہ مندرجات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

بے رحم سیاست

تحریر: عبدالکریم

اقتدار ایک ایسا نشہ ہے جس کو پانے کے لیے انسان کیا سے کیا ہو جاتا ہے، اس کو پورا کرنے کے لیے اندھا، بہرا، پاگل، حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ یہی ہمارے سیاستدانوں کا حال ہے جو ہر وقت اقتدار کے حصول کے چکر میں رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں جیسے تیسے ان کو اقتدار ہی میں رہنا ہے۔ یہ انسان کی خصلت ہے کہ اس کو اقتدار میں رہنا پسند ہے۔ ہمارے ملک کی جتنی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کو ہر وقت حکومت میں ہی رہنا اچھا لگتا ہے۔ جیسے ہی یہ لوگ حکومت سے اترتے ہیں یا اتارے جاتے ہیں ان کو لگتا ہے کہ ہم سے اچھی حکومت اس ملک میں کوئی چلا ہی نہیں سکتا۔ ہر سیاسی پارٹی جب اقتدار میں ہوتی ہے وہ یہی سمجھ رہی ہوتی ہے کہ صرف یہی پارٹی عوام کی خدمت کر رہی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پاکستان میں سیاسی پارٹیاں ایک ذات کے گرد گھومتی ہیں، ہر سیاسی پارٹی کا ایک گاڈ فادر ہے۔ پوری سیاسی پارٹی اس گاڈ فادر کو پروٹیکٹ کرتی ہے۔ اس کے اچھے برے فیصلوں کے آگے سر خم تسلیم رہتا ہے۔ اس پارٹی کے گاڈ فادر کا جو بھی بیانیہ ہو اس کو سارے لوگ لے کر چلتے ہیں۔ یہ سیاسی لوگ اس سیاسی گاڈ فادر کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ اس کے لیے مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان سیاسی پارٹیوں کے منشور میں آپ کو صرف کاغذی طور پر عوام کی محبت نظر آئے گی۔ ویسے ان سیاسی پارٹیوں کے نزدیک عوام ایک ٹشو پیپر ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے نزدیک عوام کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہر سیاسی پارٹی انتخابات سے پہلے عوام کو سبز باغ دکھاتی ہے اور جب ووٹ لے کر یہ پارٹیاں حکومت بناتی ہیں تو عوام کو بھول جاتی ہیں۔ اسی طرح سابقہ حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ عمران خان نے اقتدار میں آنے سے پہلے لوگوں کو سبز باغ دکھائے، لوگوں نے ان کی بھی اندھی تقلید کی، ان کو ووٹ دیا، اقتدار میں لائے لیکن عوام اب بھی مہنگائی کی چکی میں پس رہے ہیں۔ مہنگائی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ عوام کو گدھوں کی طرح نوچا جا رہا ہے۔ کوئی ایک چیز ایسی نہیں کہ حکومت کے کنٹرول میں ہو۔ گندم مافیا، چینی مافیا، ادویات مافیا، آٹا مافیا، تیل مافیا، گیس مافیا، تاجر مافیا، ٹرانسپورٹ مافیا، ایسا لگتا ہے یہ ملک نہیں، گینگسٹرز کا اڈا ہے۔ جو بھی جو مرضی چاہے کر رہا ہے۔ حکومت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ ایسا نہیں کہ یہ سارا قصور موجودہ حکومت کا ہے، مافیاز کوئی ایک دن میں نہیں بنتے۔ سالوں لگتے ہیں۔ مافیاز بننے میں موجودہ حکومت کے ساتھ ساتھ پچھلی حکومتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔ ہر حکومت نے ان مافیاز کو بنانے میں کردار ادا کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مافیاز میں کون لوگ ہوتے ہیں؟ یہ وہی لوگ ہوتے جو مالدار ہوتے ہیں۔ بڑی بڑی ملوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ارب پتی لوگ ہوتے ہیں اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہمارے ملک میں الیکشن لڑتے ہیں۔ حکومتیں بناتے اور توڑتے ہیں۔ کون ہے جو ان کو نہیں جانتا مگر یہ لوگ اتنے طاقتور ہوتے ہیں کہ ہر حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ ہر حکومت کی مجبوری ہوتے ہیں، اس لئے آپ ان کو پولیٹیکل مافیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ملک کے سرمایہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے پاس بہت پیسے کی ریل پیل ہوتی ہے، یہ پیسے سے ووٹ کو خریدتے ہیں اور پیسے سے ووٹ کو عزت دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں کو الیکٹیبل بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی الیکٹیبل ہر پارٹی کو حکومت بنانے کے لیے چاہیے ہوتے ہیں۔ حکومتوں میں ان الیکٹیبل کا بڑا اہم رول ہوتا ہے۔ آسان زبان میں آپ ان کو آزاد امیدوار بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس مافیا کی تازہ ترین مثال آپ گلگت بلتستان کے الیکشن میں دیکھ لیں جس میں موجودہ حکومت کی اپنی سادہ اکثریت بھی نہیں تھی لیکن پھر اس حکومت نے آزاد امیدواروں کو اپنی پارٹی میں شامل کر کے سادہ اکثریت لی ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں پاکستان میں ہونے والے ہر الیکشن میں ان آزاد امیدواروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے کیونکہ یہ کاروباری اور پیسے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ پیسے سے الیکشن جیت کر آتے ہیں، پھر یہ حکومت کی مجبوری بن جاتے ہیں۔ یہ اگر حکومت سے کوئی عہدہ نہ بھی لیں تو ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہر حکومت سے اپنے کاروبار کے لیے فائدہ لے لیتے ہیں۔ پی ڈی ایم بھی ایک ایسا ٹولہ ہے جس کو عوام کی کوئی فکر نہیں ہے، یہ ٹولہ اپنی سیاسی

بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔اس ٹولے کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔اب ملک میں کورونا کی دوسری لہر عروج پر ہے۔عام آدمی ایک تو مہنگائی اور بھوک سے مر رہا ہے لیکن پی ڈی ایم کا ٹولہ عوام کو کورونا سے بھی مارنا چاہتا ہے۔ان کو عوام کی کوئی فکر نہیں،ان کے لیے عمران خان کی حکومت کو گرانا اہم ہے۔بغض عمران میں اتنے آگے جا چکے ہیں یہ چاہتے ہیں عوام ان کی وجہ سے کورونا کا ہی شکار کیوں نہ ہو، یہ ہر صورت میں جلسوں کے ذریعے موجودہ حکومت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔اس ٹولے کو کون سمجھائے کہ پاکستان میں کبھی بھی حکومتیں جلسے جلوسوں سے نہیں جاتی ہیں۔حکومت کہہ رہی ہے جو کہ بالکل درست بات ہے کہ پی ڈی ایم کے جلسوں سے کورونا بہت پھیلے گا لیکن اپوزیشن بغض عمران میں اس حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہے جس میں سب سے زیادہ نقصان عام شخص کا ہوگا۔چاہے وہ اموات کی صورت میں چاہے وہ لاک ڈاؤن ہو،اگر اموات ہونگی تو زیادہ تر غریب آدمی مریں گے اور اگر لاک ڈاؤن ہوگا تو بھی غریب کا ہی نقصان ہے جس سے کاروبار بند ہونگے۔غریب آدمی بھوک سے مرے گا۔اپوزیشن کی منطق بڑی عجیب ہے، وہ سمجھتی ہے کہ موجودہ حکومت کورونا سے بڑا خطرہ ہے،اگر یہ حکومت رہتی ہے لوگ کورونا کی بجائے حکومت کی ناقص معاشی پالیسیوں کی وجہ سے زیادہ مریں گے۔اپوزیشن کے نزدیک ایک عام آدمی کی موت سے زیادہ اہم اس حکومت کا خاتمہ ہے جو کہ اپوزیشن کا جہالت پر مبنی مفروضہ ہے۔عوام اس اپوزیشن کو بھی دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح عوام کی خدمت کر رہے ہیں،عوام دیکھ رہے ہیں اپوزیشن لاشوں کی سیاست چاہتی ہے حالانکہ کسی بھی جمہوری ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔اپوزیشن کہہ رہی ہے کہ یہ حکومت نواز شریف صاحب کی والدہ کی موت پر سیاست کر رہی ہے،مریم نواز شریف نے اپنی دادی کی موت پر ایک سیاسی جلسے میں سیاسی بیان دیا کہ اس حکومت نے مجھے میری دادی کی وفات کا نہیں بتایا اور میں اپنے والد کو کہتی ہوں یہ ظالم لوگ ہیں۔آپ اپنی والدہ کی میت کے ساتھ ملک میں واپس نہ آئیں،اس کے بعد حکومتی ترجمانوں نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔نواز شریف کی والدہ شریف فیملی کے لیے سب سے بڑا نقصان ہیں۔نواز شریف کی والدہ نواز شریف اور شہباز شریف کے درمیان ایک پل تھیں،دونوں بھائیوں میں جتنے سیاسی اختلافات ہوتے تھے،ان کے حل میں ان کی والدہ کا ہمیشہ بہت کردار رہا ہے۔شہباز شریف صاحب کہہ رہے ہیں قومی مکالمہ یعنی بات چیت ہونی چاہئے، انتقام کی سیاست کو ختم ہونا چاہیے،حکومت نے گالم گلوچ سے سیاست کو گالی بنا دیا ہے۔جمہوریت کا حسن بھی یہی ہے کہ معاملات بات چیت سے ہی حل ہونے چاہییں۔اپوزیشن اور حکومت جمہوریت کا حسن ہے۔اپوزیشن کو چاہیے حکومت سے براہ راست بات کرے اور حکومت کو بھی اپوزیشن کی طاقت کو ماننا چاہیے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔ہمیشہ اختلافات کا حل بات چیت ہی ہوتا ہے اور بات چیت کے لیے حکومت اور اپوزیشن کو ایک دوسرے کو تسلیم کرنا ہوگا۔

مقابلہ ڈاکومینٹریز

لاہور انٹرنیشنل کے یوٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیئے کی ڈاکو مینٹریز بنائیں اور انعام پائیں۔زیادہ سے زیادہ ویڈیوز بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے مواقع پائیں۔ ان ڈاکو مینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشی،.....ہو۔ان ڈاکو مینٹریز کو یوٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تکنیکی معاملات کے ساتھ ساتھ نتائج کا فیصلہ.....اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسند ناپسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکو مینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکو مینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

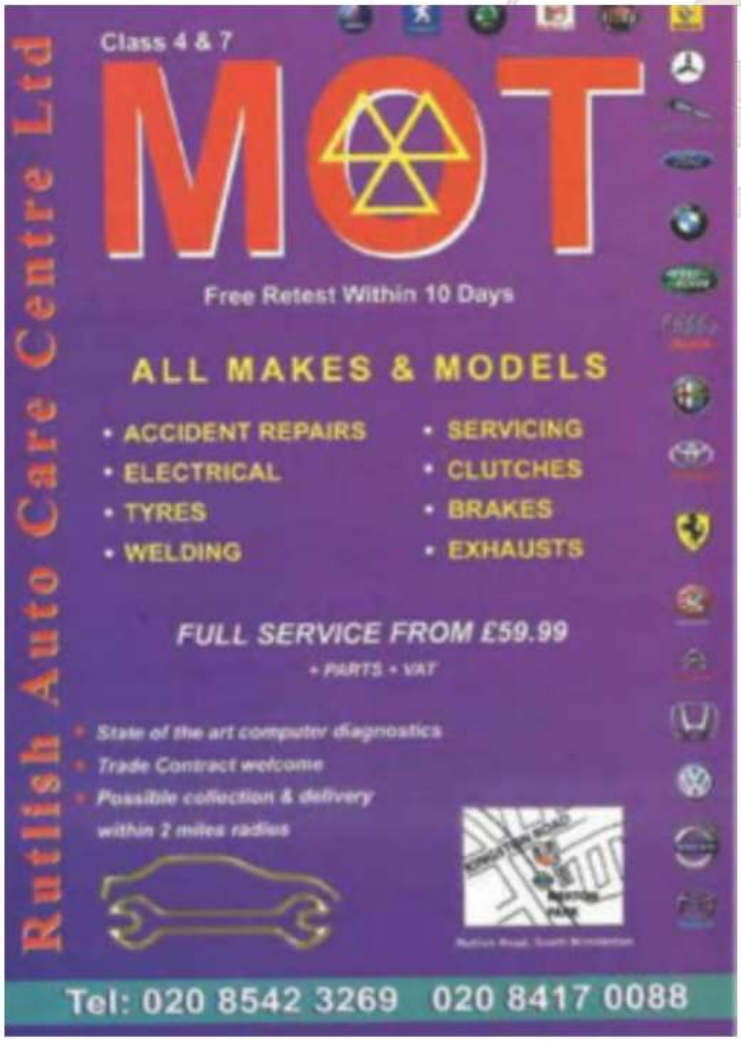

کیسے کیسے انمول ہیرے لوگ

برٹش انڈین آرمی کے میجر جنرل ہیکٹر پینٹ کی بیٹی شیلا آئرن پینٹ ،ایک برطانوی خاتون جنہوں نے 1887 میں لکھنو یونیورسٹی سے گریجویٹ کیا۔ان کی والدہ برہمن فیملی سے تھیں جنہوں نے کرسچن مذہب اختیار کیا تھا۔انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز بطور ٹیچر گوکھلے میموریل اسکول کلکتہ سے کیا۔سن 1931 میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ اندر پرستھا کالج ،دہلی میں بطور اکنامک پروفیسر تعینات ہوئیں۔

آپ جانتے ہیں یہ پاکستانی تاریخ کی کون سی مشہور ترین شخصیت تھیں؟ آیئے میں آپ کو بتاتا ہوں۔شیلہ آئرن پینٹ نے 1932 میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم

محترم لیاقت علی خان شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شادی کی۔تب مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے اپنا نام بیگم رعنا لیاقت علی رکھ لیا۔

یوں تو وہ بہت ہی عمدہ اخلاق اور اعلیٰ کردار کی مالک تھیں۔لیکن ایک ایسا سچ جو بہت کم لوگوں کو شاید معلوم ہو وہ یہ کہ جب وہ پاکستان کی سفیر بن کر ہالینڈ گئیں تو ہالینڈ کی ملکہ ان کی بہت گہری دوست بن گئی۔ان دونوں کی اکثر شامیں شطرنج کھیلتے ہوئے گزرتی۔ایک دن ہالینڈ کی ملکہ نے ان سے کہا کہ اگر آج کی بازی تم جیت گئی تو میں اپنا ذاتی شاہی قلعہ تمہارے نام کردوں گی۔بیگم صاحبہ نے اس کی اس بات کو منظور کرلیا اور کچھ دیر بعد بیگم رعنا لیاقت علی شطرنج کی بازی جیت گئی۔ملکہ نے وعدے کے مطابق شاہی قلعہ ان کے نام کردیا۔ماضی کے اس سچے واقعے کا ایک حیرت انگیز اور خوشگوار پہلو یہ ہے کہ بطور سفیر ان کی وہاں ملازمت ختم ہوئی تو اپنے اس ذاتی قلعے کو انہوں نے پاکستانی سفارت خانے کو ہدیہ کردیا۔آج بھی پاکستانی سفارتخانہ اسی شاہی قلعے میں واقع ہے۔میں نے جب یہ پورا واقعہ پڑھا تو بیگم صاحبہ کے کردار کا موازنہ عصر حاضر کے مشہور و معروف سیاستدانوں سے کیا تو یہ بونے تو مجھے کسی قطار میں کھڑے نظر نہیں آئے سوائے کرپشن اقربا پروری لوٹ کھسوٹ اور ملک کا ستیاناس کرنے کے اللہ تعالیٰ نے ماضی میں اس ملک کو ایسے زرخیز لوگ دیئے تھے لیکن افسوس کہ آج پاکستانیوں نے ان کی قدر نہیں کی افسوس کہ آج ہم ان کی قربانیوں کو بھول گئے ہیں۔

پاکستان کے پہلے وزیرِ خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان کتاب تحدیثِ نعمت میں بیان کرتے ہیں :1954ء میں جب میں وزیرِ خارجہ تھا میں نے محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خاں کو آمادہ کیا کہ وہ ہالینڈ میں پاکستانی سفیر کا منصب منظور فرمائیں۔انکی رضامندی حاصل ہونے کے بعد چودھری محمد علی صاحب بوگرا وزیرِ اعظم اور ملک غلام محمد صاحب گورنر جنرل کی منظوری سے ان کا تقرر عمل میں آیا اور ستمبر 1954ء میں انہوں نے اپنے منصب کی ذمہ داری سنبھال لی۔جون 1961ء تک بیگم صاحبہ اس منصب پر فائز رہیں۔اس کے بعد انہیں اٹلی میں پاکستانی سفیر مقرر کیا گیا اور وہ روم تشریف لے گئیں۔میں بھی بین الاقوامی عدالت کا رکن منتخب ہوکر جنوری 1955ء میں ہیگ آ گیا اور فروری 1961ء تک وہاں رہا۔چونکہ اس سارے عرصے میں بیگم صاحبہ ہیگ میں پاکستانی سفیر تھیں اس لئے میں ذاتی علم کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو بڑی قابلیت اور بڑے وقار کے ساتھ سرانجام دیا۔ہالینڈ میں ان کا نام نامی اور پاکستان کا نام مترادف ہوگئے تھے اور اس ملک میں اب تک انہیں نہایت احترام کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ملکہ ہالینڈ کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔وہ ہالینڈ کے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں حلقوں میں مقبول تھیں ان کے متعلق عام رائے یہ تھی کہ ملکہ جولیانہ کے بعد وہ ملک کی سب سے ہردلعزیز خاتون ہیں۔ہالینڈ کی سب یونیورسٹیوں میں بھی ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا تھا۔ان کا قاعدہ تھا کہ اپنی استقبالی دعوتوں میں التزام کے ساتھ باری باری یونیورسٹیوں کے

چیدہ چیدہ طلباء کو مدعو کرتی تھیں ۔ اور ان کی مہمان نوازی کا خاص خیال رکھتی تھیں ۔ جو طلباء دُور سے آتے تو رسمی دعوت کے بعد ان کے لئے کھانے کا انتظام بھی فرماتیں ۔ ایسی مادرانہ شفقت کا اظہار ایک مشفق خاتون ہی کی طرف سے ہوسکتا تھا۔ ان انتظامات میں ان کی ذاتی سیکرٹری مس کیتھرین مائلز ان کی دست راست تھیں ۔ میرے ساتھ شفقت اور تواضع کا جو سلوک بیگم صاحبہ نے اور ان کی وجہ سے پاکستان سفارت خانے کے جملہ افسران اور عملے کے افراد نے روا رکھا اس کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔ فجزاھم اللہ الحسن الجزاء۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے مجھے ارشاد تھا کہ ہری ہفتے اور اتوار کی سہ پہر کو 5 بجے درِ دولت پر حاضر ہوں اور دونوں دن شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں۔ کھانے پینے کے سلسلے میں میری ہر طبی احتیاط اور طبعی رغبت کا پورا لحاظ رکھا جاتا۔ اس لئے مجھے ہیگ کے قیام کے دوران مجھے ذرہ بھر بھی بے وطنی کا احساس نہ ہوا۔ یہ سب بیگم صاحبہ کی شفقت اور تواضع کا کرشمہ تھا۔ میرے دل سے ہر روز ان کے لئے دعا بلند ہوتی ہے۔ یہ کوئی رسمی جملہ نہیں بلکہ لفظاً اور معناً حقیقت ہے۔

بیگم رعنا لیاقت علی خاں کی اسلامی غیرت کی دو مثالیں: میرے دل میں محترمہ بیگم صاحبہ کی قدر و منزلت ان کی اسلامی غیرت کے احساس کی وجہ سے بھی ہے ایک دن دوپہر کے وقت ٹیلیفون پر ارشاد فرمایا کہ سہ پہر کے اجلاس کے لئے عدالت واپس جاتے ہوئے یہاں سے ہوتے جانا اور تاکید فرمائی کہ تین بجے سے پہلے ہی آجانا۔ میں پونے تین بجے حاضر ہوگیا۔ حاضر ہونے پر دیکھا کہ بہت اضطراب کی حالت میں ہیں ایک ٹائپ شدہ دو ورقہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ مجھے دیتے ہوئے فرمایا پڑھو! وہ ہیگ کے ایک روزنامے کے افتتاحیہ کا انگریزی ترجمہ تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ انڈونیشیا کی حکومت اپنی ہر کمزوری اور خامی کا الزام ہالینڈ کے سر تھوپتی ہے۔ اتنا نہیں سوچا جاتا کہ ملک کی بھاری کثرت اسلام جیسے دقیانوسی مذہب کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے جو ان کے ترقی کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ پہلے اس سبب کا علاج کریں پھر ہم پر الزام عائد کریں۔ فرمایا اس کا جواب لکھو۔ کب تک تیار کرلو گے میں نے کہا تیار ہوجائے گا۔ جواب تیار ہوجانے پر میں نے اطلاع کی تو فرمایا ہمارا تعلقات عامہ کا افسران دنوں چھٹی پر ہے۔ تمہارے تیار کردہ جواب کا ہولندی زبان میں جلد ترجمہ ہونے کا کیا انتظام کیا جائے۔ میں نے کہا آپ فکر نہ کریں میں مسز زمرمان (ایک مسلمان ماہر ترجمہ ہولندی خاتون) سے جلد ترجمہ کرالوں گا۔ چنانچہ ترجمہ جلد تیار ہوگیا اور تجویز ہوئی کہ مکرم حافظ قدرت اللہ صاحب امام مسجد مبارک ہیگ ہالینڈ جوابی مضمون لے کر خود اخبار کے ایڈیٹر سے ملیں اور اس کی اشاعت کا مطالبہ کریں۔ حافظ صاحب مضمون لے کر گئے۔ ایڈیٹر نے جواب پڑھ کر فرمایا ہم ضرور کل ہی شائع کردیں گے لیکن جواب ذرا طویل ہے سارے جواب کی گنجائش پرچے میں نہیں ہوگی۔ ہم ضروری حصوں کو خلاصے کے طور پر ترتیب دے لیں گے۔ انہوں نے اپنا وعدہ بڑے عمدہ طور پر پورا کردیا۔ فجزاہ اللہ۔ بیگم صاحبہ نے مضمون کی نقول تمام سفارت خانوں میں بھجوادیں۔ ایک دن پھر بڑے اضطراب کی حالت میں طلب فرمایا۔ معلوم ہوا ان کے ایک پاکستانی مسلمان نوجوان ملازم نے جو کراچی میں ان کے ہاں کا ہی پروردہ تھا اور جس کے والد نے اس کے ہیگ آنے سے پہلے کراچی میں اس کی شادی بھی کردی ہوئی تھی ہالینڈ میں شادی کی ٹھانی ہے اور لڑکی کے اصرار پر عیسائی مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہے اور اس نیت سے ایک پادری کی شاگردی میں گرجا کی رسوم وغیرہ سیکھ رہا ہے۔ بیگم صاحبہ بڑے جوش میں تھیں اور مصر تھیں کہ سفارت خانے کا سرکاری عملہ بھاگ دوڑ کر کے غروبِ آفتاب سے پہلے اس ملازم کو پاکستان جانیوالے ہوئی جہاز پر سوار کر کے رپورٹ کرے۔ یہ رپورٹ بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچی تو کہیں جا کر ان کی طبیعت قابو میں آئی۔ اس وقت تک یہ بار بار یہی کہتی رہیں۔ لیاقت علی خاں کے گھر میں پلا ہوا شخص اور عیسائی ہونے پر رضامند ہوجائے!

حوالہ تحدیثِ نعمت صفحہ (624-625)

❁❁❁

سردار عبدالرب نشتر نے قائداعظم کے بارے میں اپنی کتاب میں ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے۔

جب ہم مانکی سے رخصت ہورہے تھے تو قائداعظم آگے آگے تھے اور پیر صاحب مانکی شریف سمیت پیران ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب قائداعظم موٹر میں بیٹھ گئے تو میں بھی ساتھ بیٹھا اور موٹر روانہ ہوگئی تو میں نے کہا قائداعظم مجھے ہنسی آتی تھی لیکن میں نے ضبط کرلی۔ پوچھا کیوں؟

میں نے کہا' جب ہم ان پیروں کے پاس جاتے ہیں تو بہت عزت واحترام سے ان کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں لیکن آج تمام پیر آپ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے تو مجھے ہنسی آرہی تھی۔' فرمانے لگے' تمہیں معلوم ہے اور ان کو بھی معلوم ہے کہ میں متقی، پرہیزگار اور زاہد نہیں ہوں۔ میری شکل وصورت زاہدوں کی سی نہیں ہے۔ مغربی لباس پہنتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو یہ یقین ہوگیا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق میرے ہاتھ میں محفوظ ہیں اور میں اپنی قوم کو کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کرسکتا۔ (''قائدِ اعظم بحیثیت گورنر جنرل'' سے) ❁❁❁

شعبہ پاکستان

پاکستان کی ٹیسٹ کرکٹ میں انٹری: اور فضل محمود کو چھٹی دینے کے احکامات وزیراعظم ہاؤس سے براہ راست آئے

تحریر: عبدالرشید شکور

2 دسمبر 1951 کو فضل محمود کے ونگ شاٹ نے پاکستانی کرکٹ ٹیم کو مارلی بورن کرکٹ کلب (ایم سی سی) کے خلاف دوسرے غیر سرکاری ٹیسٹ میچ میں چار وکٹوں سے کامیابی سے ہمکنار کیا تو کراچی جم خانہ کرکٹ گراؤنڈ میں موجود ہزاروں شائقین کے جوش وخروش کا ٹھکانہ نہ تھا۔

مارلی بورن کرکٹ کلب کے خلاف کامیابی کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ یہ کلب دنیائے کرکٹ کے سب سے معزز گراؤنڈ لارڈز کرکٹ گراؤنڈ کا مالک ہے، اور آج بھی ٹیسٹ کرکٹ کے قوانین ایم سی سی کے ذمے ہیں۔ اس یادگار لمحے کو دیکھنے والوں میں خواجہ ناظم الدین بھی شامل تھے جنھیں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد وزیراعظم بنے ہوئے صرف ڈیڑھ ماہ ہی ہوا تھا۔ خواجہ ناظم الدین پاکستانی ٹیم کی اس جیت پر اس قدر خوش تھے کہ انھوں نے میچ کے اختتام پر فضل محمود اور کپتان عبدالحفیظ کاردار کے ہاتھ تھامتے ہوئے فضا میں بلند کیے اور جذباتی انداز میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ اس میچ نے پاکستان کی کرکٹ کو ایک نئی شناخت دی تھی اور اسی جیت کی بنیاد پر اسے بین الاقوامی کرکٹ کھیلنے کا استحقاق حاصل ہوا۔ میچ کے اختتام پر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے فاتح ٹیم کے اعزاز میں عشائیے کا اعلان کیا جو دس روز بعد کراچی میں ہونا تھا۔

فضل محمود کی ڈیوٹی پر واپسی

فضل محمود جنھوں نے کراچی کے اس غیر سرکاری ٹیسٹ میں ایم سی سی کی پہلی اننگز میں شاندار بولنگ کرتے ہوئے چھ وکٹیں حاصل کی تھیں، میچ کے بعد فرنٹیئر میل میں سوار ہوئے اور راولپنڈی روانہ ہو گئے جہاں پولیس کی ملازمت کے دوران ان کی پوسٹنگ ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ انھوں نے ایم سی سی کے خلاف اس سیریز میں حصہ لینے کے لیے ایک ماہ کی رخصت لے رکھی تھی جو اب ختم ہو رہی تھی۔ فضل محمود کو راولپنڈی پہنچنے پر وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی طرف سے ٹیم کو دی جانے والی دعوت کا پتا چلا تو انھوں نے ایس پی پولیس سے درخواست کی کہ انھیں اس دعوت میں شرکت کے لیے ایک ہفتے کی چھٹی دی جائے لیکن ایس پی کا جواب کچھ اس طرح تھا 'یہ صرف ایک ڈنر ہے، آپ اسے بھول جائیں اور اپنی ڈیوٹی پر توجہ دیں۔ فضل محمود نے اپنی کتاب میں لکھا ہے 'میں اس بات پر بہت دلبرداشتہ ہوا اور اپنے ایک فوجی دوست کو پورا واقعہ بتایا جس نے مجھ سے کہا کہ فکر نہ کرو تمہیں ایک گھنٹے کے اندر چھٹی مل جائے گی اور ہوا بھی ایسا ہی کیونکہ ڈی ایس پی نے آ کر مجھے بتایا کہ آپ کی چھٹی کی درخواست منظور ہو گئی ہے۔ دراصل فضل محمود کے اس فوجی دوست نے اپنے جس افسر سے بات کی وہ وزیراعظم کے ملٹری سیکریٹری کے قریبی ساتھی تھے، یوں وزیراعظم ہاؤس سے براہ راست فضل محمود کو چھٹی دینے کے احکامات آئے تھے۔

تو آپ کو اجازت مل گئی!

فضل محمود نے کراچی پہنچ کر وزیراعظم کے عشائیے میں شرکت کی جس کی سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے جیسے ہی فضل محمود کو دیکھا وہ فوراً بولے تو آپ کو اجازت مل گئی۔ خواجہ ناظم الدین نے اس موقع پر اعلان کیا کہ آئندہ سے جو بھی کھلاڑی پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی طرف سے کھیل رہا ہوگا اسے اس کا ادارہ یا محکمہ قومی ڈیوٹی تصور کرے گا۔

تم نے مجھے پھانسی کے پھندے سے بچا لیا

جب ایم سی سی کی کرکٹ ٹیم پاکستان کے دورے پر پہنچی تو پاکستان کرکٹ بورڈ کے کچھ عہدیداران کا خیال تھا کہ فضل محمود انٹرنیشنل کرکٹ کے لیے اتنے اچھے نہیں ہیں۔ فضل محمود کو سیالکوٹ میں ہونے والے سہ روزہ میچ میں کھلایا گیا جس میں انھوں نے نہ صرف پانچ وکٹیں حاصل کیں بلکہ 42 رنز بھی بنائے۔ پاکستان اور ایم سی سی کے درمیان لاہور میں کھیلے گئے پہلے غیر سرکاری ٹیسٹ میں فضل محمود ان فٹ ہونے کی وجہ سے مؤثر بولنگ نہ کر سکے اور ان کے ہاتھ کوئی وکٹ نہ آ سکی۔ جب کراچی میں ہونے والے دوسرے غیر سرکاری ٹیسٹ کے لیے پاکستانی ٹیم کا اعلان ہوا تو اس میں فضل محمود کا نام شامل نہیں تھا لیکن اسی رات انھیں ایک سلیکٹر ڈاکٹر دلاور حسین کا فون موصول ہوا جن کا کہنا تھا کہ آپ ٹیم میں شامل ہیں۔ میچ کے پہلے دن کھانے کے وقفے سے قبل ہی فضل محمود ایم سی سی کی بیٹنگ لائن کو اپنی خطرناک بولنگ سے بکھیر چکے تھے۔ جب وہ پویلین کی طرف جا رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر دلاور حسین سامنے کھڑے ہیں جنھوں نے فضل محمود سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا 'پتر تم نے مجھے پھانسی کے پھندے سے بچا لیا ہے۔' فضل محمود نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ 'میں حیران تھا کہ اس بات کا کیا مطلب ہے؟ پتا چلا کہ دیگر سلیکٹرز مجھے ٹیم میں شامل کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن ڈاکٹر دلاور حسین نے ان سے یہ جھوٹ بول کر مجھے ٹیم میں شامل کیا تھا کہ سلیکشن کمیٹی کے سربراہ جسٹس کارنیلیس کی ہدایت ہے کہ فضل محمود کو ٹیم میں شامل کیا جائے۔

نئے زمانے کے شیخ چلی

تحریر: محمد کامران کھاکھی

شیخ چلی کی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ ہم سب نے اس کی کہانی پڑھ رکھی ہے کہ کیسے اس نے اہلیت نہ ہونے کے باوجود ایسے خواب دیکھے جو اس کی پہنچ سے دور تھے۔ مگر وہ ان کو حاصل کرنے میں اس قدر پر اعتماد تھا کہ اس نے اپنا نقصان ہی کر ڈالا، یعنی انڈوں کی ٹوکری گرا کر تمام انڈے ہی توڑ ڈالے۔

یہی حال کچھ اس وقت پاکستان کی حکمراں جماعت کا ہے کہ تقریباً چھ فیصد کی شرح ترقی انھیں بہت کم لگی اور انھوں نے ملک کو سو فیصد ترقی یافتہ بنانے کا سوچا، مگر وہ منفی اعشاریہ چار پہ دھڑام سے جا گری۔ پھر بھینسوں، کٹوں، مرغیوں، انڈوں سے اس کو سہارا دینے کی سوجھی تو مرغیوں نے ہڑتال کر دی اور انڈوں کی قیمت دگنی بڑھ گئی۔ پھر غریب عوام کا خیال دل میں سما گیا اور ان کے لیے کچھ کرنے کی سوجھی اور تاریخ میں پہلی بار غریب لوگوں کے لیے لنگر خانے کھول دیے گیے۔ اب اس سے زیادہ کسی حکمران کو غریب کا خیال کیسے ہوسکتا ہے۔ مگر ان لنگر خانوں میں کھانا پکنے اور غریب کا پیٹ بھرنے سے جناب آٹا اور چینی صاحب غصہ کر گئے اور ان کی قیمتیں آسمان کو چھونے لگیں۔ غریب تو غریب، ان اجناس ضروریہ کی بے رخی سے تو سفید پوش بھی بلبلا اٹھے۔

مگر حاکم وقت کو عوام سے بہت پیار ہے۔ جانتے نہیں کہ انہوں نے کھیل کود سے جو بھی کمایا اس سے خود عیاشی نہیں کی بلکہ درد دل رکھنے کی وجہ سے غریب عوام کے لیے کینسر کا اسپتال بنایا۔ آمدنی کم ہونے کی وجہ سے در بدر ٹھوکریں کھا کر پیسہ جوڑا، مگر غریبوں کے لیے اسپتال بنا کر چھوڑا۔ اس ہمدردانہ کام پر بھی کچھ لوگوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھا اور انہوں نے ان پر فارن فنڈنگ کیس کر دیا کہ جی بیرون ملک سے ناجائز طریقے سے پیسے لیے گئے۔ بھئی پیسے لیے تو اپنے ملک میں لائے ناں، کوئی باہر تو نہیں لے گئے۔ کوئی منی لانڈرنگ تو نہیں کی ناں اور پھر اچھے کاموں کے لیے ہی استعمال ہوئے ناں۔ تبدیلی لانے کے لیے کتنی محنت درکار ہوتی ہے ان نااہل لوگوں کو کیا علم۔

ھر ماحولیات کی آلودگی سے جہاں عام آدمی کا دم گھٹ رہا تھا تو حاکم وقت کہاں آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے ملین ٹری سونامی شروع کر دیا اور درخت لگانے شروع کر دیے تاکہ ماحول کو آلودگی سے پاک اور خوشگوار بنایا جاسکے۔ اس کے اور بھی کئی فوائد ہیں جیسے فضا میں آکسیجن کی پیداوار میں اضافہ، جنگلی حیات میں اضافہ، کیونکہ چڑیا گھروں میں ان جانوروں کی جان ہی خطرے سے دوچار ہے، اسی لیے تو کاون کو دیس نکالا ملا۔ اب اگر جنگل ہوتے تو کیوں ہم کاون کو کسی دوسرے ملک کے حوالے کرتے بھلا، بلکہ اس کے ساتھیوں کو اپنے ملک میں لاتے ناں۔ اتنی سی بات پتہ نہیں لوگوں کو سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اور سب سے اہم فائدہ اس جنگل سے حاصل ہونے والے شہد کی پیداوار ہے۔ اب بھلا اس نیک کام سے دشمنوں کو آرام کہاں سے آنا تھا، تو انہوں نے اس پر اعتراضات اٹھانے شروع کر دیے کہ درخت تو لگے ہی نہیں اور اگر لگے ہیں تو سو لگا کر ہزار کا خرچہ ڈالا گیا۔ اور تو اور یہ تو انہوں نے حد ہی کر دی کہ جو شہد ان درختوں سے حاصل ہوگا اس کا برانڈ نیم گنڈا پوری شہد ہوگا۔ عوام کی بھوک اور غربت کے خیال نے حاکم وقت کو بہت تڑپایا۔ جب کوئی بھی اسکیم کارگر ثابت نہیں ہو رہی تو بھنگ کی کاشت کا سوچا گیا کہ اس کی پوری دنیا میں بہت مانگ ہے اور اس سے کئی ادویہ بھی تیار ہو رہی ہیں۔ مگر دشمنوں نے اس کا بھی مذاق بنا لیا۔ پھر سونے پہ سہاگہ غربت میں ڈوبی اس قوم کو کورونا نے آ پکڑا۔ کہتے ہیں ناں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آتی، اپنے ساتھ بربادی بھی لاتی ہے۔ تو مصیبت تو اس قوم پر آئی سو آئی، ساتھ میں بربادی بھی لائی اور اب ساری قوم غم و غصہ سے بپھری اپنے ہی بال نوچ رہی ہے، سوائے حکومتی معاون کاروں کے، کہ ان کے لیے تو سب اچھا ہے۔

پھر بھی حاکم وقت نے ہمت نہیں ہاری اور وقفے وقفے سے قوم کے دکھ درد کا مداوا اپنی حرکتوں، بڑھکوں، دعووں اور سہانے خوابوں کے ذریعے کرتے رہتے ہیں اور اپنے ترجمانوں کو بھی سختی سے تلقین کر دی کہ سب اچھا ہے، لوگوں کو بھی بتاؤ۔ اور ان کے وفادار عوام اب بھی یہ یقین رکھتے ہیں اس حاکم وقت سے بڑھ کر اور کوئی مسیحا ہے ہی نہیں، اس لیے قدر کرو اس کی۔ ملک کے غریب عوام حکمرانوں کے لیے گئے قرض کے بوجھ تلے دب چکے ہیں، جس کی وجہ سے حاکم وقت اقتدار میں آنے سے پہلے بھی گھلتے رہے اور اقتدار میں آ کر بھی انہیں ان قرضوں کا بہت زیادہ احساس تھا کہ ملک کے عوام بہت زیادہ مقروض ہیں۔ اس لیے صرف دو سال میں 14 ہزار ارب کے مزید قرض لے

کرانہوں نے ان قرضوں سے نجات کی تاریخ میں پہلی دفعہ کوشش کی، جو کہ ان کی نیک نیتی کا ثبوت ہے۔ اپنی اس کوشش کے لیے انہیں کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑے کہ ملکوں ملکوں جا کر ان غریبوں کی وجہ سے مانگنا بھی پڑا اور آئی ایم ایف نے تو حد کر دی کہ قرض دینے کے لیے انہوں نے مہنگائی بھی کرا ڈالی۔ مگر ہمارے حاکم وقت نے ہمت نہیں ہاری اور ان کی ہر خواہش پوری کی، باوجود اس کے ان کی شرائط ان کے کہنے سے پہلے ہی گئی گنا زیادہ پوری ہو چکی تھیں۔ آج سے کوئی چار پانچ سال پہلے ایک ریسرچ کافی مقبول ہوئی، جسے ''ڈننگ کروگر ایفیکٹ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ڈننگ کروگر اثر اس وقت پایا جاتا ہے جب افراد اپنی ذاتی اہلیت کی سطح کا صحیح طریقے سے تجزیہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ ایک علمی تعصب ہے جس میں نااہل افراد اپنے آپ کو سب سے زیادہ اہل تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ''امپوسٹر سنڈروم'' ہے جو بہت قابل افراد کے خیال میں ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے کم مجاز ہیں۔ یعنی علم والا اپنے آپ کو کم علم تصور کرتا ہے جیسا کہ مشہور زمانہ سائنسدان آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ ''میں جتنا سیکھتا جاتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی کم علمی کا احساس ہوتا جاتا ہے''۔ ڈننگ کروگر اثر کی عام مثال سیاستدان اور مشہور شخصیات ہیں، جو کسی بھی موضوع کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے باوجود اس کے بارے میں جرات مندانہ غلط دعوے کرتے ہیں اور پھر اس کو صحیح ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، کیونکہ ان میں خود اعتمادی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ چارلس ڈارون نے ایک بار کہا تھا ''لاعلمی اکثر علم سے زیادہ اعتماد پیدا کرتی ہے''۔

ڈننگ کروگر کی فالواپ ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ جو عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا، وہ تنقید بھی قبول نہیں کرتا اور وہ اپنی خود کی بہتری میں دلچسپی ظاہر کرنے کا کم سے کم امکان رکھتے ہیں۔ یہی حال ہمارے اس وقت کے حکمرانوں کا ہے کہ اہل لوگوں کے مقابلے میں خود کو ہی بہت زیادہ اہل تصور کرتے نظر آتے ہیں۔ اسی کا عملی مظاہرہ ایک وزیر موصوف نے یہ کہہ کر کیا کہ ''ہم عالموں سے بہتر اسلام کو سمجھ سکتے ہیں''۔ مدینہ کی ریاست کے دعوے دار شاید ریاست کا علم تو رکھتے ہوں مگر مدینہ کے ''م'' سے بھی ناآشنا لگتے ہیں۔ یہ نئے زمانے کے شیخ چلی اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت نہ رکھتے ہوئے ملک کو تجربات کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ ناقدین پابند سلاسل ہوئے جاتے ہیں، عقلمند لوگ خاموش تماشائی ہیں اور عوام ان کے ہر تجربے پر قہقہہ لگاتے ہیں، نتائج پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے اپنے روزگار کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔

غزل

عجب عالم ہے دل کی سادگی کا
ابھی تک منتظر ہے وہ اسی کا۔
جو بھی آئے کفن بر دوش آئے
یہی دستور ہے اس کی گلی کا۔
عبث ہے یاں کسی پر ناز کرنا
بلا مطلب نہیں کوئی کسی کا۔
اٹھائیں زندگی کے ناز کیا ہم
بھروسہ ہی نہیں جب زندگی کا
زمانے بھر کو جس نے روشنی دی
اندھیرا اب مقدر ہے اسی کا
سبھی کچھ ہے تمہارے پاس لیکن
کوئی معیار بھی ہے زندگی کا۔
تمہیں قائل نہیں فیاض ورنہ
زمانہ معترف میری خودی کا۔

.....ڈاکٹر فیاض احمد (علیگ)

لاہور انٹرنیشنل رسالہ کی توسیع اشاعت میں حصہ لینا آپ کا قومی فرض ہے۔

جب پاکستانی بشیر ساربان بنے امریکی نائب صدر کے مہمان

تحریر: عقیل عباس جعفری محقق و مورخ، کراچی

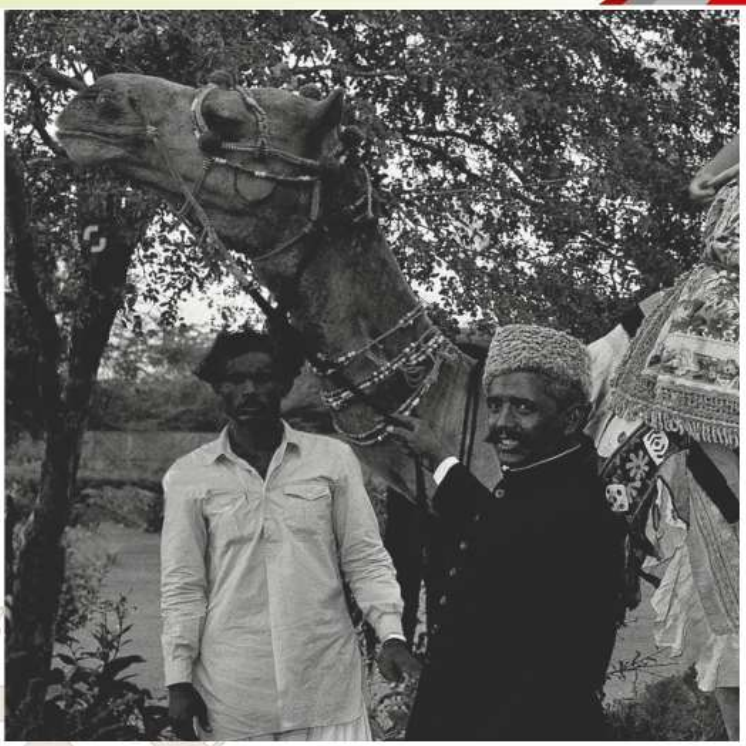

20 مئی 1961 کو امریکہ کے اُس وقت کے نائب صدر لنڈن بی جانسن پاکستان کے دورے پر کراچی پہنچے تھے۔ اُن کا قافلہ ڈرگ روڈ (موجودہ شارع فیصل) پر ہوائی اڈے سے ایوانِ صدر کی طرف رواں دواں تھا۔ سڑک کے اطراف ان کا خیر مقدم کرنے والی عوام کا ہجوم تھا۔ جانسن نے تمام سفارتی اور حفاظتی آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے کئی بار راستے میں اپنی گاڑی روکی اور گاڑی سے اُتر کر لوگوں سے ہاتھ ملائے اور خوش خلقی سے باتیں کیں۔ ڈرگ روڈ ریلوے سٹیشن کے نزدیک انھیں اچانک ایک اونٹ گاڑی نظر آئی۔ وہ اپنے قافلے کو رُکوا کر گاڑی سے اترے اور حفاظتی تدابیر کا خیال کیے بغیر سیدھے اس گاڑی کے مالک کے پاس پہنچ گئے جس کا نام بشیر احمد تھا۔ انھوں نے ترجمان کی مدد سے اس سے بے تکلفانہ گفتگو کی۔ اونٹ گاڑی پر بھوسہ لدا ہوا تھا۔ لنڈن بی جانسن کے استفسار پر بشیر احمد نے انھیں بتایا کہ یہ مویشیوں کا چارہ ہے اور اس کے اونٹ کی عمر پانچ سال ہے۔ بشیر احمد نے جانسن کو یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے اونٹ کو پیار سے 'غازی' کہتا ہے۔ بشیر احمد کی سادگی پر جانسن بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس سے کہا کہ آج سے ہم دونوں دوست ہیں اور کیا وہ اپنے اس نئے دوست سے ملنے کے لیے امریکہ آنا پسند کریں گے۔ بشیر احمد نے جواب دیا' کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بے شک، بے شک۔ شکریہ، شکریہ۔' ان الفاظ کے علاوہ وہ کچھ اور نہ کہہ سکے۔

اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ جانسن نے بشیر کو ایک خوبصورت بال پوائنٹ قلم تحفے کے طور پر دیا۔ بشیر احمد امریکی نائب صدر سے اس اتفاقیہ ملاقات کو شاید بھول جاتے مگر اگلے دن تمام پاکستانی اخبارات میں ان کی خوبصورت تصاویر چھپی ہوئی تھیں۔ راتوں رات وہ پاکستان کے ایک بڑے آدمی بن گئے تھے۔ چند دن بعد روزنامہ 'جنگ' کراچی میں معروف کالم نگار ابراہیم جلیس نے اپنے کالم 'وغیرہ وغیرہ' میں اس واقعے کا ذکر کیا اور لنڈن بی جانسن کے اس اقدام کی بڑی تعریف کی۔ ادھر امریکی سفارت خانے نے اس کالم کا ترجمہ لنڈن بی جانسن کو، جو امریکہ پہنچ چکے تھے، روانہ کر دیا۔ یہ کالم پڑھ کر لنڈن بی جانسن کو کراچی کا اونٹ گاڑی بان اور اس کو دی گئی دعوت یاد آ گئی۔

لنڈن بی جانسن نے فوری طور پر بشیر احمد کو سرکاری طور پر امریکہ آنے کی دعوت بھجوا دی۔ جس کے بعد اخباری نمائندوں، امریکی سفارت خانے کے افراد، سیاح اور تماش بین سبھی نے لانڈھی میں اُن کی بوسیدہ جھونپڑی پر یلغار کر دی۔ بشیر احمد اس جھونپڑی میں اس وقت سے مقیم تھے جب وہ اپنا گھر بار بریلی میں چھوڑ کر پاکستان آئے تھے۔ بشیر احمد امریکی نائب صدر کی دعوت ملنے کے بعد ایک اور الجھن میں مبتلا ہوئے کہ وہ روز کنواں کھودتے تھے اور روز پانی پیتے تھے اگر وہ امریکہ چلے گئے تو ان کے بچوں کا رزق کیسے چلے گا۔ امریکی سفارت خانے نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا کہ بشیر احمد کی عدم موجودگی میں اُن کے بچوں کو 25 روپے روزانہ دینے کا انتظام کر دیا۔ بشیر احمد اس طرف سے مطمئن ہوئے تو انھوں نے اپنے یادگار سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ادھر امریکی ذرائع ابلاغ میں جب یہ خبر عام ہوئی تو 'ریڈرز ڈائجسٹ' نے امریکہ میں بشیر احمد کا میزبان بننے کی پیشکش کر دی اور یوں پاسپورٹ اور ویزے کے مراحل سے گزرنے کے بعد 14 اکتوبر 1961 کو بشیر احمد امریکہ کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ سفر پر روانگی سے قبل حکومت پاکستان نے بشیر احمد کے ملبوسات پر خصوصی توجہ دی اور انھیں تین شیروانیاں اور ایک جناح کیپ تحفے میں پیش کیں تاکہ وہ امریکہ پہنچ کر ایک باوقار پاکستانی کی طرح نظر آئیں۔ حکومت نے لنڈن بی جانسن کو پیش کرنے کے لیے کچھ تحائف بھی ان کے ہمراہ کر دیے۔ بشیر احمد جب امریکہ کے لیے روانہ ہوئے تو امریکی سفیر ولیم ایم راؤٹر بہ نفس نفیس انھیں ہوائی جہاز کی سیڑھیوں تک چھوڑنے کے لیے

آئے۔ امریکی فضائی کمپنی 'پین ایم' نے انھیں فرسٹ کلاس میں امریکہ کا سفر کروایا۔ ان کے لیے پاکستانی کھانے کا خاص انتظام کیا اور ان کے ہمراہ اُردو بولنے والا ایک پاکستانی کر دیا تا کہ ان کا سفر آسانی سے کٹ سکے۔ بشیر احمد اونٹ گاڑی بان، جسے اب بشیر ساربان کہا جانے لگا تھا، لندن سے ہوتے ہوئے امریکہ پہنچے۔ لندن اور نیویارک، دونوں مقامات پر بشیر ساربان کو سرکاری مہمان کا پروٹوکول دیا گیا۔ امریکہ میں اُن کا استقبال کرنے والوں میں امریکہ میں پاکستان کے سفیر عزیز احمد بھی شامل تھے۔ بشیر احمد کا یہ دورہ تقریباً دو ہفتے جاری رہا۔ نائب صدر جانسن نے ان سے اپنی ملاقات کی تجدید کی۔ جانسن نے بشیر احمد کو دیکھ کر ان سے تکلفاً کہا کہ 'افسوس ہے کہ آج یہاں کا موسم خراب ہے اور خنک ہوائیں چل رہی ہیں۔' بشیر احمد نے ترجمان کی مدد سے نہایت قرینے سے جواب دیا' جب تک لوگوں کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے، سرد ہواؤں سے کچھ نہیں ہوتا۔' بشیر احمد کو نیویارک میں والڈ روف سٹوریا ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور انھیں اقوام متحدہ کے صدر دفاتر اور ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی سیر کروائی گئی۔ ان کی ملاقات امریکہ کے ایک سابق صدر ہیری ایس ٹرومین سے بھی کروائی گئی جو بشیر احمد سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ امریکی ذرائع ابلاغ کو جب بشیر ساربان کی امریکہ آمد کی خبر ملی تھی تو وہ اسے ایک دلچسپ واقعہ سمجھے تھے اور انھوں نے اپنے مزاح نگار کالم نگاروں کو بشیر ساربان کے دورے کی کوریج کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ مگر اس دورے کے دوران بشیر ساربان نے، جو بالکل بھی پڑھے لکھے نہیں تھے، اپنی ذہانت سے بھرپور باتوں سے امریکی ذرائع ابلاغ کو بڑا متاثر کیا۔ ابراہم لنکن کی یادگار پر بشیر احمد نے کہا' جب کوئی شخص اپنے ملک کے لیے جان قربان کر دیتا ہے اور ملک اس کی خدمات کو سراہتا ہے تو ایک ایسی ہی یادگار بنا دی جاتی ہے جو قیامت تک قائم رہتی ہے۔' امریکی کانگریس کو دیکھنے کے بعد بشیر احمد نے کہا کہ' جب بہت سے لوگ مل کر کسی مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کا حل بہتر نکلتا ہے۔ ایک دماغ سے غلطی کا امکان ہے لیکن جب ہزاروں دماغ ایک ساتھ مل کر کام کریں تو غلطیوں کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔' انھوں نے مجمع میں ایک لڑکی کو دیکھ کر کہا کہ' بیٹی کی مثال گھر میں اسی طرح ہوتی ہے جیسے موسموں میں بہار کا موسم ہوتا ہے۔' ان سے پوچھا گیا کہ' اونٹ کیسا جانور ہے؟' تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ' اونٹ کی مثال عورت کی طرح ہے جس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔'

بشیر احمد جہاں کہیں بھی گئے دلچسپ باتوں کے پھول برساتے گئے، امریکی ذرائع ابلاغ نے لکھا کہ' یہ یقین کرنا خاصا مشکل ہے کہ بشیر احمد ایک ان پڑھ شخص ہے۔'

ٹائم میگزین نے لکھا کہ' بشیر احمد نے عوام اور اخباری نمائندوں سے نمٹنے میں ایک مغل شہزادے کی سی آن بان سے کام لیا۔' خود بشیر احمد کے ترجمان سعید خان نے کہا کہ 'بشیر اس روانی اور فصاحت سے باتیں کرتے تھے کہ ان کا ترجمہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔'

بشیر احمد کو امریکہ کے مختلف اداروں نے بہت سے تحفے تحائف دیے جن میں فورڈ کمپنی کی جانب سے دیا گیا ایک ٹرک بھی شامل تھا جس پر سفید اور سبز رنگ کر کے اسے پاکستانی پرچم سے ہم آہنگ کیا گیا تھا۔ لنڈن بی جانسن نے بشیر ساربان کے بیٹے کے لیے ایک سپورٹس سائیکل بھی بطور تحفہ پیش کی۔ جانسن نے بشیر احمد کو ہاتھ میں پہننے والی ایک سنہری الارم والی گھڑی بھی پیش کی جو بشیر کو بہت پسند آئی۔ لنڈن بی جانسن نے سفر کے اختتام پر بشیر ساربان کو عمرہ کروانے کی پیشکش کی۔ بشیر ساربان لنڈن بی جانسن کی اس عنایت پر اشکبار ہو گئے اور انھوں نے امریکی نائب صدر کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ چند ماہ بعد مارچ 1962 میں امریکی صدر کی اہلیہ مسز جیکولین کینیڈی اور ان کی بہن رازیوال نے پاکستان کا خیر سگالی دورہ کیا۔ ان کا یہ دورہ 21 مارچ 1962 کو لاہور سے شروع ہوا جہاں ان کا پُرجوش استقبال کیا گیا۔ دورے کے آخری مرحلے میں 25 مارچ 1962 کو وہ کراچی پہنچیں۔ اسی روز انھوں نے کراچی کے ایوان صدر میں امریکہ کے نائب صدر لنڈن بی جانسن کے دوست بشیر ساربان سے ملاقات کی۔ اس موقع پر بشیر ساربان نے اپنی بیوی اور بچوں سے مسز کینیڈی کا تعارف کروایا اور انھیں اپنے اونٹ' غازی' پر سیر کی دعوت دی۔ مسز کینیڈی نے یہ دعوت بڑی خوش دلی سے قبول کی اور اپنی بہن کے ساتھ ایوان صدر کے لان میں پانچ منٹ تک بشیر کے اونٹ کی سواری کی۔ مسز کینیڈی اس سواری سے بہت خوش ہوئیں اور انھوں نے اس اونٹ کے ساتھ کئی تصاویر بھی بنوائیں۔ سنہ 1971 میں جب ضیا محی الدین نے پاکستان ٹیلی وژن سے اپنا مشہور شو شروع کیا تو انھوں نے اس پروگرام میں بشیر ساربان کو بھی مدعو کیا۔ انھوں نے بشیر ساربان سے پوچھا کہ انھوں نے پاکستان واپس آ کر اونٹ گاڑی چلانا کیوں چھوڑ دیا ہے تو بشیر ساربان نے بے ساختہ جواب دیا کہ مجھ سے جانسن نے کہا تھا کہ پاکستان واپس جا کر میری پوزیشن کا خیال رکھنا۔ سنہ 1963 میں جان ایف کینیڈی کے قتل کے بعد لنڈن بی جانسن امریکہ کے صدر بن گئے اور اس عہدے پر وہ سنہ 1968 تک فائز رہے۔ 22 جنوری 1973 کو جب لنڈن بی جانسن کا انتقال ہوا تو میڈیا کو بشیر ساربان ایک مرتبہ پھر یاد آئے۔ وہ کراچی میں امریکی قونصل خانے میں مدعو کیے گئے جہاں انھوں نے لنڈن بی جانسن کے انتقال پر رکھی گئی تعزیتی کتاب میں اپنے تاثرات رقم کیے۔ اس کے بعد بشیر ساربان ایک مرتبہ پھر غربت اور گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو گئے اور 14 اگست 1992 کو جب اُن کا انتقال ہوا تو بہت سے لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس گمنام شخص کی خبریں اور تصاویر کبھی دنیا بھر کے اخبارات میں صفحہ اوّل کی زینت بنی تھیں۔

چکوال پاکستان کے ایک گاؤں کا عبدالخالق عالمی ایتھلیٹ

چکوال سے کوئی 40 کلومیٹر شمال مشرق کی طرف جائیں، تو ایک چھوٹا سا خاموش گاؤں آتا ہے، جس کا نام جنداعوان ہے۔ بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ اس گاؤں کے قبرستان میں ایک ایسی قبر ہے، جس میں لیٹے انسان نے تن تنہا پاکستان کا پرچم بین الاقوامی سطح پر، ایک بار نہیں بار بار بلند کیا۔ عبدالخالق کو بچپن ہی سے بھاگنے کا جنون تھا۔ ایک بار پاکستان آرمی کے برگیڈیر رودھم نے اس کی کبڈی اور ریس کا مقابلہ دیکھا، تو اسے آرمی میں جوانوں کی ٹریننگ پر آمادہ کیا۔ یہ کام اس نے آخر دم تک بخوبی نبھایا اور بے شمار مایہ ناز اتھلیٹ پاک آرمی کو دیے۔ وہ پاک آرمی میں صوبیدار خالق کے نام سے مشہور تھا۔ اس اکیلے اتھلیٹ نے نیشنل گیمز میں 100 سونے کے تمغے اور انٹرنیشنل مقابلوں میں 26 گولڈ، 16 سلور اور بے شمار برونز میڈل جیتے۔ 1954ء منیلا ایشین گیمز میں نا صرف گولڈ میڈل جیتا بلکہ 6-10 سیکنڈ میں 100 میٹر کا نیا ریکارڈ بھی بنایا۔ اس سے پہلے یہ ریکارڈ ایک انڈین اتھلیٹ کے پاس تھا۔ اس کی اس شاندار کامیابی پر جواہر لال نہرو نے اسے "فلائنگ برڈ آف ایشیا" یعنی "ایشیا کا پرندہ" کا خطاب دیا۔ 1958ء ٹوکیو کی ایشین گیمز ہوں، 1956ء کی میلبورن اولمپکس ہوں یا 1960ء کی روم اولمپکس، صوبیدار خالق 100 میٹر میں گولڈ میڈل جیت کر لایا۔ 1958ء کی ایشین گیمز میں ملکھا سنگھ پہلی بار منظر عام پر آیا۔ نیشنل لیول پر اس کا خوب نام تھا، مگر صوبیدار خالق نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ اس وقت عبدالخالق کا طوطی سر چڑھ کر بولتا تھا۔ 200 میٹر کی ریس کا اختتام بہت ڈرامائی تھا، جس کے نتیجے کا اعلان بھی بہت دیر میں ہوا۔ ملکھا اور خالق برابر تھے۔ آخر بہت سارے زاویوں سے تصویریں دیکھنے اور ایکسپرٹس کے مشوروں کے بعد ملکھا سنگھ 6-21 سیکنڈ کو گولڈ اور عبدالخالق کو 7-21 سیکنڈ کے ساتھ سلور میڈل دیا گیا۔ اس مقابلے کے بعد ان دونوں کھلاڑیوں کا اگلا مقابلہ بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

1960ء میں صدر ایوب خان نے دونوں ملکوں کے تعلقات میں نرمی لانے کے لئے لاہور میں انڈو پاک گیمز کا انعقاد کیا۔ یوں تو لاتعداد ایونٹس میں بے شمار اتھلیٹ میدان میں اترے تھے، مگر سب کی نظریں 200 میٹر کے مقابلے پر لگی تھیں، جس میں انڈیا کی طرف سے ملکھا سنگھ اور پاکستان کی طرف سے عبدالخالق کی دوڑ ہونا تھی۔ کھیلوں کا آخری دن تھا۔ صدر صاحب خود یہ مقابلہ دیکھنے اور انعامات تقسیم کرنے سٹیڈیم آئے تھے۔ لوگوں کا جوش دیدنی تھا۔ سٹیڈیم کھچا کھچ بھرا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نا دیتی تھی۔ لوگ گلے پھاڑ پھاڑ کر اپنے اپنے وطن کے ان اتھلیٹس کے لئے نعرہ بازی کر رہے تھے اور شاید بارڈر کے دونوں طرف کے باقی کروڑوں لوگ بھی جذبات کی اس گرمی کو محسوس کر رہے تھے۔ ہر گھر اور دکان پر ریڈیو آن تھا۔ اس جذباتی فضا میں ریفری نے پستول فضا میں بلند کیا اور ریس کا آغاز ہو گیا۔ 20 سیکنڈ کی ایک ریس کے لئے ایسا ماحول پہلے کبھی نا دیکھا گیا تھا۔ عبدالخالق پاکستان کا فیورٹ تھا تو ملکھا سنگھ انڈیا کا۔ دونوں میں اپنے وطن کا پرچم بلند کرنے کی دھن سوار تھی۔ مگر مقابلے کے دو فاتح تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بہر طور کسی ایک ہی نے جیتنا تھا اور وہ خوش قسمت ملکھا سنگھ نکلا۔ قسمت کی دیوی اس دن اس پر مہربان تھی اور وہ آخری سیکنڈ کے میں عبدالخالق کو پیچھے چھوڑتا ہوا ریس جیت گیا۔ اس دن صدر ایوب خان نے ملکھا سنگھ کو "فلائنگ سکھ" کا خطاب دیا، جو وہ ہمیشہ ہر انٹرویو میں فخر سے بتاتا رہا۔ عبدالخالق عوام کا مجرم ٹھہرا۔ کروڑوں دلوں کو توڑنے کا صدمہ، اس نے دل پر لے لیا اور اس کے بعد گم نامی کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس نے 1971ء کی جنگ میں بھی حصہ لیا اور جنگی قیدی بنا۔ بارڈر کے اس پار اب بھی اس کی بہت عزت تھی۔ اندرا گاندھی نے خصوصی طور پر اس کی رہائی کا بندوبست کیا، مگر اس غیور اتھلیٹ نے انکار کر دیا اور کہا وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ ہی واپس جائے گا۔ 1988ء میں راولپنڈی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ٹی وی پر خبر چلی، نا کسی سوگ کا اعلان ہوا۔ بس اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک کالمی خبر اور 100 میٹر ریس کا ایک درخشاں باب بند ہو گیا۔ 1960ء میں صوبیدار خالق کے ہارنے کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ بنیادی طور پر 100 میٹر کا چیمپئن تھا اور ملکھا سنگھ 200 میٹر کا۔ عینی شاہدین کا بتانا ہے کہ پہلے 100 میٹر میں عبدالخالق ہی آگے تھا، مگر اگلے 100 میٹر وہ اپنی رفتار برقرار نہ رکھ سکا۔ ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کا پریشر مہمان کی نسبت میزبان پر ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ ملکھا سنگھ اس کا فائدہ اٹھا کر تاریخ میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو گیا۔ پانچ دہائیوں بعد راکیش اوم پرکاش مہرا نے ملکھا سنگھ پر ایک بائیوپک بنائی اور وہ سپر ہٹ تھی۔ مہرا نے اپنے پچاس سال پرانے ہیرو کو دوبارہ زندہ کر دیا اور پورے ہندوستان میں ایک بار پھر ملکھا سنگھ کا نام گونج اٹھا۔ ہمارے یہاں اپنے ہیروز کو خراج تحسین پیش کرنے کا رواج کبھی بھی نہیں رہا۔ 1958ء سے 1964ء کے درمیان ملکھا سنگھ نے صرف 5 انٹرنیشنل گولڈ جیتے اور عبدالخالق نے 34، مگر پھر بھی اسے اتنی پذیرائی کبھی نا ملی جو بھارت میں ملکھا کو ملی۔ امید کی جا سکتی ہے کبھی وقت بدلے گا اور کوئی فلم میکر اپنے اس گمنام ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرے گا اور نئی نسل کو اس کے کارناموں سے روشناس کرائے گا۔ انسان بھلے سو بار جیتتا رہا ہو، مگر کئی مقابلے ایسے ہوتے ہیں، جن میں اس کی ایک ہار گائیڈڈ میزائل کی طرح زندگی بھر اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ صوبیدار خالق بھی اسی گائیڈڈ میزائل کا شکار ہو گیا۔ منقول (بشکریہ ریاض ملک چکوال)

دیوی اس دن اس پر مہربان تھی اور وہ آخری سیکنڈ کے میں عبدالخالق کو پیچھے چھوڑتا ہوا ریس جیت گیا۔ اس دن صدر ایوب خان نے ملکھا سنگھ کو "فلائنگ سکھ" کا خطاب دیا، جو وہ ہمیشہ ہر انٹرویو میں فخر سے بتاتا رہا۔ عبدالخالق عوام کا مجرم ٹھہرا۔ کروڑوں دلوں کو توڑنے کا صدمہ، اس نے دل پر لے لیا اور اس کے بعد گم نامی کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔ اس نے 1971ء کی جنگ میں بھی حصہ لیا اور جنگی قیدی بنا۔ بارڈر کے اس پار اب بھی اس کی بہت عزت تھی۔ اندرا گاندھی نے خصوصی طور پر اس کی رہائی کا بندوبست کیا، مگر اس غیور اتھلیٹ نے انکار کر دیا اور کہا وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ ہی واپس جائے گا۔ 1988ء میں راولپنڈی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ناٹی وی پر خبر چلی، نا کسی سوگ کا اعلان ہوا۔ بس اخبار کے اندرونی صفحے پر ایک کالمی خبر اور 100 میٹر ریس کا ایک درخشاں باب بند ہو گیا۔

1960ء میں صوبیدار خالق کے ہارنے کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ بنیادی طور پر 100 میٹر کا چیمپئن تھا اور ملکھا سنگھ 200 میٹر کا۔ عینی شاہدین کا بتانا ہے کہ پہلے 100 میٹر میں عبدالخالق ہی آگے تھا، مگر اگلے 100 میٹر وہ اپنی رفتار برقرار نہ رکھ سکا۔ ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراوڈ کا پریشر مہمان کی نسبت میزبان پر ہمیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ ملکھا سنگھ اس کا فائدہ اٹھا کر تاریخ میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہو گیا۔ پانچ دہائیوں بعد راکیش اوم پرکاش مہرا نے ملکھا سنگھ پر ایک بائیو پک بنائی اور وہ سپر ہٹ تھی۔ مہرا نے اپنے پچاس سال پرانے ہیرو کو دوبارہ زندہ کر دیا اور پورے ہندوستان میں ایک بار پھر ملکھا سنگھ کا نام گونج اٹھا۔ ہمارے یہاں اپنے ہیروز کو خراج تحسین پیش کرنے کا رواج کبھی بھی نہیں رہا۔ 1958ء سے 1964ء کے درمیان ملکھا سنگھ نے صرف 5 انٹرنیشنل گولڈ جیتے اور عبدالخالق نے 34، مگر پھر بھی اسے اتنی پذیرائی کبھی نا ملی جو بھارت میں ملکھا کو ملی۔ امید کی جا سکتی ہے کبھی وقت بدلے گا اور کوئی فلم میکر اپنے اس گمنام ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرے گا اور نئی نسل کو اس کے کارناموں سے روشناس کرائے گا۔ انسان بھلے سو بار جیتتا رہا ہو، مگر کئی مقابلے ایسے ہوتے ہیں، جن میں اس کی ایک ہار گائیڈڈ میزائل کی طرح زندگی بھر اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔ صوبیدار خالق بھی اسی گائیڈڈ میزائل کا شکار ہو گیا۔ منقول

(بشکریہ ریاض ملک چکوال)

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر "ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل" اور خواتین ڈائجسٹ "آبگینے" ملاہور رسالہ ہر دو زبانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی سالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسالے ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا برنس مین یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میسر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی ماہانہ مالی مدد فرما کر اس کار خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپکی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہو گی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC
Account Name:
Lahore International LTD
Account No:
42534160
Sort Code:
30-96-26
IBAN: GB89Loyd
3096242534160

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی اور ثقافتی صورتحال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار ہے۔

میڈم نور جہاں کی زندگی پر ایک نظر: ملکہ ترنم کا خطاب کس نے دیا؟

تحریر: عقیل عباس جعفری محقق و مورخ، کراچی

انڈیا اور پاکستان کی فلمی صنعت کی بہت سی شخصیات کو ان کے چاہنے والوں نے ایسے خطابات سے نوازا ہے جو ان کی شخصیت کے ساتھ مخصوص ہو گئے ہیں اور جب وہ خطاب زبان پر آتا ہے ذہن پر اس شخصیت کا نام دستک دینے لگتا ہے۔

نور جہاں کے بارے میں لکھی گئی اکثر کتب اور مضامین میں بتایا جاتا ہے کہ نور جہاں کو یہ خطاب 1965 کی انڈیا پاک جنگ کے بعد صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے دیا تھا جبکہ زخمی کانپوری کی تحقیق کے مطابق نور جہاں کو یہ خطاب ان کے مداحوں نے فلم انتظار کے گیتوں پر دیا تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم پری چہرہ کہیں تو ذہن میں نسیم بانو کا نام ابھرتا ہے۔ ملکۂ موسیقی کے ساتھ روشن آرا بیگم کا نام مخصوص ہے۔ عوامی اداکار کہیں تو ذہن میں علاؤالدین کا نام آتا ہے۔ آہو چشم کا خطاب راگنی کی یاد دلاتا ہے، دختر صحرا ریشماں کہلاتی ہیں اور ملکۂ جذبات نیر سلطانہ، شہنشاہ غزل مہدی حسن کو کہا جاتا ہے تو چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کہلاتے ہیں۔ اسی طرح دیبا کو مونالیزا، دلیپ کمار کو کنگ آف ٹریجڈی، مینا کماری کو کوئن آف ٹریجڈی، اعجاز کو خوبرو اعجاز، مینا شوری کو لارا لپا گرل، نینا کو پراسرار نینا، شیاما کو چنچل شیاما، ناڈیہ کو فیئرلیس (بے خوف) ناڈیہ اور صادق علی کو پرنس آف منروا کہا جاتا ہے۔ اب بہت سے خطابات کے ساتھ ساتھ ایک خطاب ملکۂ ترنم بھی ہے، جو نور جہاں کی شخصیت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔ جن اداکاروں اور گلوکاروں کے نام اوپر لیے گئے انھیں خطابات کب اور کس نے دیے اور وہ خطابات کیونکر ان کی شخصیت کا حصہ اور وجہ تعارف بنے، اس پر وقت کی دھول جم چکی ہے۔ مگر نور جہاں کو ملکۂ ترنم کا خطاب کب اور کیسے ملا، اس پر پڑی وقت کی دھول کچھ کچھ صاف ہو چکی ہے۔ آج سے ٹھیک 75 سال پہلے، 25 جون سنہ 1945 کو ایک فلم کا اشتہار شائع ہوا تھا جس میں نور جہاں کے نام سے پہلے ملکۂ ترنم کا خطاب درج تھا۔

اللہ وسائی سے بے بی نور جہاں تک

نور جہاں 21 ستمبر 1926 کو قصور میں پیدا ہوئی تھیں۔ ماں باپ نے ان کا نام اللہ وسائی رکھا اور چار سال میں انھیں موسیقی کی تعلیم کے لیے خاندانی استاد غلام محمد کے سپرد کر دیا۔ سات برس کی عمر میں انھیں موسیقی کی اتنی شد بد ہو چکی تھی کہ وہ اپنی بڑی بہن عیدن اور کزن حیدر باندی کے ساتھ سٹیج پر گانا گانے لگی تھیں۔ ابتدا میں وہ مختار بیگم، اختری بائی فیض آبادی اور دوسری گلوکاروں کے مقبول گیت گاتی تھیں۔ آٹھ نو برس کی عمر میں ان کا خاندان لاہور منتقل ہو گیا جہاں انھوں نے سٹیج پر پرفارم کرنا شروع کر دیا۔ یہیں انھیں موسیقار جی اے چشتی مل گئے جنھوں نے نور جہاں کی آواز کو مزید سنوارا اور انھیں چند طبع زاد گیتوں کی دھن بنا کر دی۔ لاہور میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کے بعد یہ بہنیں اپنے بھائی محمد شفیع کے ساتھ کلکتہ چلی آئیں۔ اس وقت کلکتہ میں مختار بیگم کا طوطی بول رہا تھا۔ اس خاندان نے جلد ہی مختار بیگم تک رسائی حاصل کر لی اور مختار بیگم کو ان بہنوں کی آواز پسند آئی۔ ان کی سفارش پر انھیں کے ڈی مہرا کی فلم کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس کمپنی نے اللہ وسائی کا نام بے بی نور جہاں رکھا جبکہ عیدن اور حیدر بائی اپنے اصل نام کے ساتھ ہی گاتی رہیں۔ تینوں بہنوں نے جس پہلی فلم میں کام کیا اس کا نام شیلا عرف پنڈ دی کڑی تھا۔ اس فلم میں مرکزی کردار پشپا رانی اور استاد مبارک علی خان نے ادا کیے تھے۔ شیلا عرف پنڈ دی کڑی ایک کم بجٹ والی فلم تھی چنانچہ اس فلم کے لیے کوئی نیا گیت نہیں کہا گیا اور پرانے لوک گیتوں سے ہی کام چلایا گیا۔ اس فلم میں نور جہاں نے ایک گانے لنگھ آجا پتن چناں دا او یار، لنگھ آجا پر پرفارم کیا جسے پسند کیا گیا اور اگلے تین چار سال تک انھیں فلموں میں ثانوی کردار ملتے رہے۔ چند فلموں میں انھیں گانے کا موقع بھی ملا جن میں مصر کا ستارہ، مسٹر اینڈ مسز بمبئی، ناری راج، ہیر سیال اور سسی پنوں کے نام شامل تھے۔

'گل بکاؤلی' سے شہرت کا آغاز

مگر جس فلم سے نور جہاں کو پہچان ملی وہ دل سکھ ایم پنچولی کی فلم گل بکاؤلی تھی۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر غلام حیدر تھے جبکہ نغمہ نگار ولی صاحب تھے۔ اس فلم کے لیے جب

نور جہاں نے اپنا پہلا نغمہ صدا بند کروایا تو ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ اس گانے کے بول تھے شالا جوانیاں مانیں، اکھانہ موڑیں، پی لیں۔

سنہ 1939 میں جب یہ فلم نمائش پزیر ہوئی تو پنجاب کا بچہ بچہ نور جہاں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے نور جہاں کے نغمات اور اداکاری سے مزید فلمیں نمائش کے لیے پیش ہونے لگیں جن میں یملا جٹ اور چودھری کے نام شامل تھے۔ خزانچی کے ایڈیٹر شوکت حسین رضوی تھے جن کے کام سے خوش ہو کر سیٹھ دل سکھ ایم پنچولی نے انھیں اردو سوشل فلم خاندان بنانے کے لیے کہا۔ شوکت حسین رضوی نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کرنے کے لیے نور جہاں کا انتخاب کیا۔ اس فلم کی موسیقی بھی ماسٹر غلام حیدر نے ترتیب دی تھی مگر نغمات لکھنے کے لیے ڈی این مدھوک کو بمبئی سے بطور خاص بلوایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر میں اچھا گانے والیوں میں اختری بائی فیض آبادی، عنایت بائی ڈھیر ووالی، طمنچہ جان، الہی جان، زینت بیگم، امراؤ ضیا بیگم اور شمشاد بیگم شامل تھیں۔ ماسٹر غلام حیدر نے گل بکاؤلی کے کامیاب تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے خاندان کے زیادہ تر گانوں کو نور جہاں کی آواز سے آراستہ کیا۔ اس فلم کے جس اشتہار میں انہیں نغموں کی رانی لکھا گیا ہے وہ لاہور کے روزنامہ انقلاب میں 5 فروری 1942 کو شائع ہوا تھا اور جناب امجد سلیم علوی کے توسط سے بہم ہوا ہے۔ اس میں نور جہاں کو نغموں کی رانی لکھا گیا ہے۔ یہ فلم اسی برس نمائش پزیر ہوئی اور اسی کی عکس بندی کے دوران نور جہاں اور شوکت حسین رضوی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ خاندان کے بعد اگلے دو تین برسوں میں نور جہاں کی بطور اداکار و گلوکار کئی فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ ان میں نوکر، دہائی، نادان، دوست اور لال حویلی شامل ہیں تاہم جب سنہ 1945 میں فلم زینت ریلیز ہوئی تو نخشب جارچوی کے لکھے ہوئے اس فلم کے نغمات نے پورے انڈیا میں دھوم مچا دی۔

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے، کچھ بھی نہ زبان سے کام لیا
اس پر بھی محبت چھپ نہ سکی جب تیرا کسی نے نام لیا

اس فلم کے دو نغمات شیون رضوی نے بھی تحریر کیے تھے۔ ابھی زینت کے نغموں کی گونج فضا میں موجود تھی کہ اِسی برس نور جہاں کی ایک اور فلم، (بڑی ماں) نمائش کے لیے پیش ہوئی اس فلم کے نغمات اور مکالمے ضیا سرحدی نے لکھے تھے اور موسیقی کے دتہ نے ترتیب دی تھی۔

نور جہاں کو ملکۂ ترنم کا خطاب کب اور کس نے دیا؟

فلمی شائقین خصوصاً نور جہاں کے مداحوں کے ذہن میں یہ سوال ہمیشہ سے موجود رہا ہے کہ نور جہاں کو ملکۂ ترنم کا خطاب کب اور کس نے دیا۔ آج سے ٹھیک 75 سال پہلے 25 جون سنہ 1945 کو ہفت روزہ چترا میں اس فلم کا جو اشتہار شائع ہوا تھا اس میں نور جہاں کے نام سے پہلے ملکۂ ترنم کا خطاب درج ہے۔ یہ اشتہار جناب سلطان ارشد کی وساطت سے دستیاب ہوا اور جناب رضا علی عابدی صاحب کی روایت کے مطابق اسے ضیا سرحدی نے تحریر کیا تھا اور نور جہاں کو ملکۂ ترنم کا خطاب عطا کرنا بھی انھی کا کارنامہ تھا۔

'بڑی ماں' کے فلم ساز اور ہدایت کار مسٹر ونائیک تھے۔ مسٹر ونائیک کے دو بچے بھی فلمی دنیا میں آئے تھے، ایک تو مشہور اداکارہ نندہ اور دوسرے ماسٹر سچن، جنھوں نے فلم (شعلے) میں امام صاحب کے بیٹے کا کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں نور جہاں کے علاوہ میناکشی، ایشور لال، یعقوب اور ستارہ کے ساتھ لتا منگیشکر نے بھی 'بے بی لتا' کے نام سے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔ نور جہاں کے بارے میں لکھی گئی اکثر کتب اور مضامین میں بتایا جاتا ہے کہ نور جہاں کو یہ خطاب 1965 کی انڈیا پاک جنگ کے بعد صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان نے دیا تھا جبکہ زخمی کانپوری کی تحقیق کے مطابق نور جہاں کو یہ خطاب ان کے مداحوں نے فلم انتظار کے گیتوں پر دیا تھا۔ مگر فلم 'بڑی ماں' کے اس اشتہار کی دستیابی کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے نور جہاں کو اٹھارہ سال کی عمر میں ملکۂ ترنم تسلیم کیا جا چکا تھا۔

اداکاری سے کنارہ کشی

قیام پاکستان کے بعد نور جہاں نے فلم (چن وے) سے اپنے پاکستانی فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ اس فلم کی ہدایات بھی انھی نے دی تھی۔ بطور اداکارہ ان کی دیگر فلموں میں 'گلنار'، 'دوپٹہ'، 'پاٹے خان'، 'لخت جگر'، 'انتظار'، 'نیند'، 'کوئل'، 'چھومنتر'، 'انارکلی' اور 'مرزا غالب' شامل ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر کے خود کو گلوکاری تک محدود کر لیا۔ ایک تاریخ کے مطابق نور جہاں نے 995 فلموں کے لیے نغمات ریکارڈ کروائے۔ بطور گلوکارہ ان کی آخری فلم (گبھرو پنجاب دا) تھی جو 2000 میں ریلیز ہوئی تھی۔ نور جہاں کے کریڈٹ پر لاتعداد غزلوں کے علاوہ 27 ملی نغمے بھی موجود ہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور نشان امتیاز بھی عطا کیا تھا۔ نور جہاں 23 دسمبر 2000ء کو دنیا سے رخصت ہوئیں اور وہ کراچی میں ڈیفینس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔

شعبہ پاکستان

پریس کلب کراچی کی چھپر چھایہ حمید چھاپرا کی رخصتی

تحریر: وارث رضا

پریس کلب کے صدر دروازے سے داخلے کے بعد کراچی پریس کلب کے ٹیرس میں ہر آنے جانے والے پر عقابی نگاہ رکھنے، اور بلند آہنگ سے آواز دینے والے حمید چھاپرا کا یہ کہنا، "میاں کہاں جا رہے ہو، ادھر تو آؤ ذرا....." کی آواز پر جب پہنچا جاتا تھا تو، "کون ہو؟ کہں کام کرتے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟" کی پوری تحقیقات کے بعد آنے والا چھاپرا صاحب کی تسلی کا پابند رہتا تھا۔ اطمنان کے بعد کلب میں بیٹھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ کسی غیر متعلقہ کے داخلے کی پابندی کے آئینی اصول پر کاربند رہنے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ پریس کلب کے وقار پر کسی بھی سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔

اسی وجہ سے ایک خاص اصول کے تحت کلب کی ممبر سازی میں میرٹ کو مقدم رکھا جاتا تھا۔ ایسا بالکل نہ تھا جیسا جماعتِ اسلامی اور جنرل ضیاء الحق کی بنائی ہوئی دستور کے دور میں کوٹہ سسٹم اور جماعتی حمایت پر کلرک، چوکی دار، پبلشر اور ایڈیٹر کو بھی ووٹ بڑھانے کی خاطر ممبر شپ دے دی گئی ہے۔ نتیجہ نہ کلب کے اصول رہے ہیں نہ وقار۔ بل کہ کلب کے عالمی و جمہوری کردار و وقار کو نیست و نابود کیا جا چکا ہے۔ کراچی پریس کلب کو عالمی صحافتی اصول اور اس کی آزادی کو سلامت رکھنے میں حکومتی مراعات کے نہ لینے اور حکومتی دباؤ سے پاک رکھنے کے ماڈل کو برطانیہ اور امریکہ نے کاپی کیا بل کہ کراچی پریس کلب میں جمہوری آزادی کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں سے متاثر ہو کر دنیا نے پریس کلبوں کو شہری آزادیوں کی آواز کا ذریعہ بنایا۔ جونھی پریس کلب میں گذشتہ شب حمید چھاپرا کے انتقال کی خبر پہنچی تو اس دَم پریس کلب کے ٹیرس میں مجھے ایسا لگا کہ پریس کلب کے دَر و دیوار دَم سادھے ایک ایسے دکھ میں مبتلا ہیں۔ گویا چھاپرا کے جانے پر ان کی چھپر چھایہ چن گئی ہو۔ ممبران و ملازمین ایک دوسرے کو مغموم آنکھوں میں پُرسہ دیتے دکھائی دیے اور لگا کہ پریس کلب کی نگرانی کرنے والا نہ رہا تو اب پریس کلب کی ساکھ رکھنے والا، ڈانٹ ڈپٹ کر لینے کا بھرم رکھنے والا کون ہوگا۔ ان کے دکھ درد کا مداوا اب کیسے ممکن ہوگا۔ یہ احساس ہی تو تھا کہ پریس کلب میں حکومتی مراعات لینے پر پابندی تھی۔ کلب کو چلانے کے لیے فنڈز کی ضرورت ممبران کی فیسوں سے پوری کی جاتی تھی اور کلب کے دیگر اُمور چلانے اور ملازمین کی تنخواہیں دینے کے لیے مزید پیسوں کی ضرورت رہتی تھی جس کو پورا کرنا ہر ماہ ایک مسئلہ تھا۔ ایک وقت پریس کلب میں ایسا بھی آیا کہ ملازمین کی تنخواہیں ادا کرنا ناممکن ہو گیا۔ اسی اثناء منہاج برنا اور دیگر نے چھاپرا صاحب کی ذمے داری لگائی کہ وہ ملازمین کی تنخواہوں کے لیے فنڈز کا انتظام کریں، جن میں حکومتی مراعات لینے پر مکمل پابندی تھی۔ یہ وہ آزمائشی لمحات تھے جب منہاج برنا اور ساتھیوں کی آبرو رکھنے اور پریس کلب کے وقار کو بچانے کے لیے حمید چھاپرا نے کمر کس لی اور اپنی برادری اور دیگر ذرائع سے فنڈز جمع کر کے ایک ایک ملازم کی تنخواہ بغیر کسی ذاتی تشہیر کے ادا کی اور پریس کلب کی لاج رکھی۔ حمید چھاپرا ایسے کردار کے غازی نہ صرف صحافیوں کی فلاح و بہبود میں جُتے رہتے تھے، بل کہ وہ کلب کے اصولوں پر بھی ہمیشہ کاربند رہتے تھے۔ اسی ضمن میں چھاپرا صاحب کا صحافتی اقدار اور اصولوں کی پاس داری کا یہ کردار نئے صحافیوں کے لیے قابلِ تقلید ہے۔ جب قومی اتحاد، PNA، کی تحریک بھٹو کو ہٹانے میں متحرک ہے اور کراچی میں تحریک کو مؤثر و متحرک کرنے کی ضرورت کے پیشِ نظر حمید چھاپرا تحریکِ استقلال پارٹی میں ذمے داریوں کے سبب کراچی میں تحریک کو خبروں کی دنیا میں مؤثر بنانے پر مامور کر دیے جاتے ہیں اور یوں قومی اتحاد کی تحریک کامیابی سے ہم کنار ہو کر ملک میں ضیائی مارشل لا لگانے کا سبب بنتی ہے؛ حمید چھاپرا کی اس غیر جمہوری کوشش و عمل کی وجہ سے کراچی پریس کلب کی باڈی نے چھاپرا صاحب کی بہ طورِ صحافی سیاست میں بہ راہِ راست متحرک ہونے اور کراچی یونین آف جرنلسٹس، KUJ اور پریس کلب سے اجازت نہ لینے پر ان کی ممبر شپ ختم کر دی گئی۔ اس پر چھاپرا صاحب نے خاموشی کے ساتھ اس سزا کو بھگتا اور مُنھ سے اُف تک نہ کیا اور نہ لبوں پر حرفِ شکایت لائے۔

اسی طرح چھاپرا صاحب نے اپنے جمہوری ذہن کا استعمال کے یو جے اور پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس، PFUJ، میں کیا اور مختلف مواقع پر وہ جنرل سیکرٹری اور صدر رہے اور اپنک کو متحرک کرنے میں بھی اپنا کردار نبھاتے رہے اور تمام تر مشکلات کے باوُجود صحافتی آزادی اور صحافی حقوق کے لیے ہمہ تن گوش رہے۔ بیماری میں بھی انھیں صحافتی اقدار کی گراوٹ اور غیر صحافی عمل کا دکھ رہا۔ ہر آنے جانے والے سے تنظیم کی یک جہتی پر زور دیتے اور صحافتی آزادی پر قدغن پر طیش میں آ جاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مَیں، ریاض عاجز اور چھاپرا ان کے گھر پر آمنے سامنے تھے، تو نقاہت کے باوُجود منہاج برنا کی جدوجُہدِ آزادی پر ڈاکیومینٹری کا سن کر چھاپرا صاحب اور ان کی بیٹی میں ایک ایسی توانائی جاگی کہ بستر سے لگے چھاپرا صاحب نے اپنی جان لیوا بیماری کی پروا کیے بغیر کسی تردُّد اٹھ کھڑے ہونے پر آمادگی ظاہر کر دی اور گرم جوشی سے منہاج برنا کے بارے میں یہ نعرہ لگاتے ہوئے جدوجہد کے اس مقام پر پہنچ گئے جہاں صرف چھاپرا صاحب کی آواز میں:

منہاج برنا۔۔ تیرے ساتھ جینا۔۔ تیرے ساتھ مرنا۔۔ منہاج برنا۔۔ سے ان کا کمرہ گونج اٹھا۔ سوچتا ہوں کہ وہ توانا آواز اب اتنی دِھیر جتا سے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔۔ اور جسے ہم آخری آرام گاہ تک پہنچا کر بھی ایک بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ چھاپرا ہم سے رخصت ہو گئے۔ حق مغفرت کرے عجب آزادانہ مرد تھا۔

بندہ ''جھلا'' ہے یا پھر ''کھوچل''؟

تحریر: محمد بلال غوری

''بندۂ خاکی'' پر بھانت بھانت کے تبصرے ہوتے رہتے ہیں، کبھی کوئی طنزیہ انداز میں کہتا ہے کہ بندہ ایماندار ہے، کبھی کوئی ''بندۂ تابعدار'' کا طرح مصرع اُچھالتا ہے تو بے باک شعرا جھوم کر پوری غزل کہہ ڈالتے ہیں۔ اسی مشاعرے میں کسی نے یہ بھی کہا کہ بندہ اناڑی نہیں بلکہ بہت بڑا کھلاڑی ہے اور سب سے کھیل رہا ہے۔ یہ تو اِس کھیل کا حسن ہے کہ کسی اناڑی کو بھی میدان میں اُتار دیا جائے تو وہ دو چار باؤنسر کھانے کے بعد نہ صرف کھلاڑی بن جاتا ہے بلکہ اِس کھیل کے اسرار و رموز جاننے کے بعد سلیکٹرز کو آنکھیں دکھانے لگتا ہے لیکن میں اِس ''بندۂ خاکی'' کا بہت بڑا مداح ہوں۔ آپ جو جی چاہے کہیں مگر مجھے تو یہ بندہ بہت کھرا، سچا اور من موجی محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ اُس کی سیاسی حکمت عملی ہو مگر وہ سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آتا ہے بلا جھجک کہہ دیتا ہے۔ اُسے یہ پریشانی بھی لاحق نہیں ہوتی کہ اِس بات کو دراصل اُس کے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آخری بار مجھے ایوان صدر کے ایک معصوم مکین کی سادگی اور بھولپن پر پیار آیا تھا جس نے کہا تھا کہ پانامہ لیکس قدرت کی طرف سے اُٹھا ہے اور اب بڑے بڑے لوگ اس کی پکڑ میں آئیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کا ایک نظام ہے، کوئی واقعہ دو ماہ بعد ہوگا، کوئی چھ ماہ بعد اور کوئی سال بعد مگر یہ اللہ کا ایک نظام ہے، سب پکڑ میں آئیں گے۔ یہ بندہ جس پر ''تابعدار'' کی پھبتی کسی جاتی ہے، اُس نے سادگی اور سادہ لوحی میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر اُس بندے نے ماضی میں اسٹیبلشمنٹ کے سیاسی کردار پر آواز اُٹھائی اور کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ ''آدمی جو کہتا ہے، جو سنتا ہے، زندگی بھر وہ صدائیں پیچھا کرتی ہیں''۔ اُس کی سچی اور کھری باتوں کی بازگشت تو اب بھی سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ فرمان عالیشان کسے یاد نہیں کہ مہنگائی اور بے روزگاری ہو تو اُس کا مطلب ہے حکمران کرپٹ ہیں۔ یہ جملے بھلا کیسے فراموش کئے جا سکتے ہیں کہ یہ حکمران ڈھیٹ ہیں، لیکن الحمدللہ مجھ میں اتنی غیرت ہے کہ اگر میرے خلاف چند سو افراد نکل آئے اور اُنہوں نے نعرہ لگا دیا کہ ''گو بندہ گو'' تو میں استعفیٰ دیکر چلا جاؤں گا۔ اور پھر خودکشی والی بات، اُسے تو نقل کرتے ہوئے بھی حیا آتی ہے۔ آپ اِس بندے کی سادگی ملاحظہ فرمائیں کہ اِس نے آف شور کمپنیوں کے خلاف تحریک چلائی اور ببانگِ دہل کہا کہ آف شور کمپنیاں لوٹ مار اور چوری کا پیسہ چھپانے کے لئے بنائی جاتی ہیں مگر پھر کیا ہوا کہ اُس کی اپنی آف شور کمپنی نکل آئی۔ اُس نے سپریم کورٹ میں چیف جسٹس کو غیر قانونی تعمیرات کے خلاف درخواست دی مگر جب سماعت شروع ہوئی اور رپورٹ سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ اُس کا اپنا گھر غیر قانونی تعمیرات میں شامل ہے۔ اُس بندے نے نہایت بے اعتنائی سے ایک شخص کو دھتکارتے ہوئے کہ اُسے تو میں چپراسی بھی نہ رکھوں اور پھر اُسے سب سے بڑے عہدے سے نواز دیا۔ اسی طرح ایک شخص جسے اس سادہ لوح شخص نے ''سب سے بڑا ڈاکو'' قرار دیا تھا، اسے بھی بہت بڑے منصب سے نوازنا پڑا۔ اسے آپ حالات کا جبر کہیں، حسن اتفاق یا پھر قدرت کا کرشمہ سمجھیں لیکن یہ بندہ جو بھی بات کرتا ہے اس کے آگے آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب یہ ''بندۂ خاکی'' سیاستدانوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انہیں اپنے ملک سے محبت نہیں، ان کے بچے بیرون ملک پڑھتے ہیں تو لوگ ہنستے ہوئے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں اور جب سانس بحال ہوتی ہے تو یہ بڑبڑاتے ہوئے پھر سے ہنسنے لگتے ہیں کہ اس کے بچے گورنمنٹ پرائمری اسکول چیچو کی ملیاں میں پڑھ رہے ہیں کیا؟ اسی طرح جب اس سادہ لوح شخص نے منشیات کی لعنت سے متعلق تقریر کرتے ہوئے یہ کہا کہ گھر کا کوئی ایک فرد بھی نشے میں مبتلا ہو تو پورے گھر کو تباہ کر دیتا ہے تو لوگوں نے اس سنجیدہ نوعیت کی بات کو بھی تفریح کا ذریعہ بنا لیا۔ اب چند روز قبل اس سادہ مزاج بندے نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اس بات کا اعتراف کیا کہ ایک سال تک تو انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کیا ہو رہا ہے اور پھر انتہائی خلوص سے ان جذبات کا اظہار کیا کہ تیاری اور تجربے کے بغیر کسی کو حکومت میں نہیں آنا چاہئے تو چاند ماری کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس بندے کے سادگی پر مبنی بیانات جمع کرنا شروع کریں تو ایک کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔

سیاسی مخالفین اسے ''تابعدار خان'' کہتے ہیں مگر سچ پوچھیں تو مجھے یہ بندہ اپنی سادگی اور صاف گوئی کے سبب اچھا لگنے لگا ہے۔ ممکن ہے ہمارے ناخدا بھی اس بندے کے بھولپن سے متاثر ہوئے ہوں اور کچھ بعید نہیں کہ اس ''بندۂ خاکی'' کی اسی سادگی کے پیش نظر حکومت اس کے حوالے کی گئی ہو۔ اور بعد میں معلوم ہوا ہو کہ سادگی اور بھولپن کا شمار اس ''بندہ خاکی'' کی کمزوریوں نہیں بلکہ طاقت میں ہوتا ہے۔ 17 ویں صدی میں اسپین کے مشہور نثر نگار، دانشور اور فلاسفر Baltasar Gracian نے کہا تھا، بسا اوقات سب سے بڑی حکومت و دانائی خود کو احمق اور بے وقوف ظاہر کرنا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس بندے نے ہسپانوی دانشور کا قول پڑھا یا سنا ہو لیکن وہ اس بات پر من و عن عمل پیرا دکھائی دیتا ہے۔ پہلے پہل لوگ اس سادہ مزاج شخص کو واقعی ''جھلا'' سمجھتے تھے لیکن اب ان کی رائے تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ یہ بندہ ''جھلا'' نہیں بلکہ توقعات سے کہیں زیادہ ''کھوچل'' ہے۔ وہ موقع کی مناسبت سے خود کو جان بوجھ کر ''جھلا'' ظاہر کرتا ہے تاکہ اسے خطرہ نہ سمجھ لیا جائے۔ خدا جانے سچ کیا ہے؟ بعض اوقات شخصیت کے سحر میں کھو جانے کے باعث خامیوں کو بھی خوبیوں کے غلاف میں لپیٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے آنے والا وقت ہی یہ طے کرے گا کہ بندہ اناڑی ہے یا کھلاڑی؟ ''جھلا'' ہے یا ''کھوچل''؟

شعبہ پاکستان

زہریلے دودھ کی زہریلی لسی ہی بنے گی

تحریر: امجد خلیل عابد

زہر کا اثر تیز تھا جس نے آٹھ کے قریب لوگوں کو باآسانی زندگی کی سرحد پار کرادی- اس بہادر بہو کو شاباش دینی چاہیے- کتنے گھرانے ہیں جہاں رضامندی نہ ہونے کا زہر قطرہ قطرہ ڈس کر لوگوں کو روز مارتا اور زندہ کرتا ہے- یہ تو اچھا ہوا کہ یکلخت موت نے آلیا- کتنے گھرانے ہیں جن میں شادی جیسے معاملہ کے لئے مذہب سے روشنی لی جاتی ہے- اول تو، لی ہی نہیں جاتی اور اگر لی بھی جاتی ہے تو من مرضی کی مفروضہ تشریح پہ عمل کیا جاتا ہے- اب من مرضی تشریح یہی ہوتی ہے کہ ہماری برادری ،قبیلہ، خاندان اور ذات۔۔ باقی تمام ذات برادریوں سے تقویٰ کے لحاظ سے افضل و برتر ہے، اور تقویٰ کی بناء پہ افضلیت ہمارے مذہب نے بھی سکھائی ہے اس لیے کمتر افراد میں بیاہے جانا ناقابلِ قبول بلکہ گناہِ عظیم ٹھہرتا ہے- زیادہ تر معاملات میں قبیلہ برادری اور نسل وقومیت کے رواج اور رسوم کو مقدم رکھا جاتا ہے- میں چونکہ رانگڑ ہوں تو بہتر ہے اپنی مثال دوں بجائے دوسروں کے گھر میں جھانکنے کے- کھوج لگانا مشکل ہے کہ رانگڑ ہندو مذہب سے اسلام کی طرف کب آئے- البتہ آج بھی بیشتر گھرانوں میں وہی ہندوانہ رسوم کو ہی سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے- پھوپھی زاد، چچازاد بہن بھائیوں کی باہم شادی ایک لمبے عرصہ تک ایک خاموش پابندی کے سائے میں رہی ہے- کیونکہ ہندو مذہب میں پھوپھی اور چچازاد بہنیں سگی بہن ہی ہیں اور ان کے ساتھ شادی نہیں ہوسکتی- کزن میرج پہ میڈیکل سائنسز کے اندیشے ایک بالکل الگ چیز ہے- شادی بیاہ کے معاملے میں ویسے بھی کسی طرح کی جدید سائنس کی تحقیقات کو نظامِ کائنات میں کسی خلل سے کم تصور نہیں کیا جاتا۔

ایک انتہائی منفی سوچ اور رواج یہ بھی ہے کہ ایک رانگڑ کبھی غیر رانگڑ سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا- گنتی کی چند مثالیں استثنائی ہیں، عمومی رجحان کی نفی نہیں کرتیں- اس لیے بھی نہیں کرتیں کیونکہ رانگڑ ذات سے باہر شادی کر لینے والوں کو رانگڑوں کی اکثریت اچھا نہیں سمجھتی- اب ایک رانگڑ مرد جب غیر رانگڑ میں شادی کرے گا اور جو بچے پیدا ہونگے وہ بچے گولے کہلائیں گے اور ان کے ساتھ تقریباً چھوت چھات والا رویہ رکھا جائے گا- اسی طرح کتنی ہی ذات برادریاں ہیں جن کو ہم جانتے ہیں جو اپنی برادری سے باہر نہیں جاتیں- ہماری والدہ کے ایک ماموں سے یہ جرم سرزد ہوا کہ پشاور میں ملازمت کے دوران ان کو پٹھان خاتون بھا گئیں اور انہوں نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کرلیا- بہن بھائیوں نے ماموں کو صرف اتنی سی سزا دی کہ ان کو ان کے زمین کے حق سے نہ صرف محروم کردیا بلکہ عمر بھر کے لیے قطع تعلق بھی کرلیا- شنید ہے کہ انہوں نے زندگی کی آخری سانسیں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو یاد کرکے روتے ہوئے گزاریں- یہ ہے وہ رواج کا زہریلا دودھ جو انسان کی زندگی کو زہریلی لسی پلا کر ہی دم لیتا ہے، اور یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے، اور کونسا اسلام ہے یہ!!!!!!!- یہ حال تو برسرِ روزگار خودمختار مرد کا کیا ہم نے، عورت ہوتی تو کیا ہوتا، یہ آپ کے سوچنے کا کام ٹھہرا- اسلام ہرگز ایسا نہیں سکھاتا- یہ ہر برداری، قبیلے قوم کا کوئی انوکھا خودساختہ مذہب ہے- مذہب کے نام پہ مسلمانوں کے لیے یہ خطہِ ارضی حاصل کیا گیا مگر یہ سوچنا بھی گناہ ہوجاتا ہے کہ میں پنجابی یا رانگڑ ہوتے ہوئے اپنی بہن یا بیٹی کا جب رشتہ تلاش کرنے نکلوں تو متوقع اچھے رشتوں کی فہرست میں کسی دوسرے قبیلے یا ذات برادری کو بھی شامل کرلوں- اسی بناء پہ مجھے یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ ہم پاکستانیوں میں جو صوبائی اور نسلی تفریق عصبیت پائی جاتی ہے وہ بھی اسی رویے کا نتیجہ ہے- ایک صوبے کی رہنے والی خاص برادری جب دوسرے صوبے کی خاص برادری سے شادی جیسا رشتے جوڑ لے گی تو پابند ہوجائے گی ان کے حقوق کا پہرا دینے اور احترام پہ کاربند ہونے کے لیے- تصور کیجئے کہ ایک خالص رانگڑ راجپوتنی اپنے ہی جیسے رانگڑ کیساتھ بیاہی جانا پسند نہیں کررہی، باہر جانا چاہتی ہے، مگر گھر کے بڑے اس کی رضامندی کو ٹھوکر پہ رکھتے ہیں۔ برادری میں اپنی ناک بچالیتے ہیں اور زبردستی شادی وہاں کی جاتی ہے جہاں لڑکی نہیں چاہتی تو پھر نتائج ایسے ہی ہونگے جیسے مظفرگڑھ کی آسیہ کی زہریلی لسی کے نکلے- گھر والے اگر سمجھتے ہیں کہ جہاں لڑکی یا لڑکا شادی کرنا چاہتے ہیں وہ رشتہ بے جوڑ ہے یا اس کے لیے نقصان کا باعث بنے گا تو ایک حد تک تو سمجھانا چاہیے مگر زبردستی کرکے خاتون کی رضامندی کو کچلنا سارے گھرانے کی میٹھی لسی کو زہریلا کرنا ہی ہے۔

رپورٹ رحمت اللہ میر بلوچ
بیورو چیف بلوچستان

رحمت اللہ بیورو چیف لاہور انٹرنیشنل/ضلع جھل مگسی بلوچستان میں عالمی وباء کرونا پھیلنے کے خدشات ہیں عالمی وبا سے پاک ضلع جھل مگسی میں دو پروگرام جیپ ریس اور ہندوؤں کی گنداواہ میں روحانی پیشوا آنجہانی بابا کرشنا نند کی 23 واں برسی کی تین روزہ مذہبی تقریبات بھی میں ہزاروں کی تعداد میں ملک کے مختلف ہندو عقیدت مند میں گنداواہ پہنچ چکے ہیں اور ابھی تک دور دراز علاقوں سے قافلوں کی آمد جاری ہے حفاظتی انتظامات کئے گئے اور ایک اہم مسلہ عالمی وبا کرونا پھیلے کا بھی اندیشہ ہے کوئی عملی حفاظتی اقدامات نہیں کیے گئے ہیں ایس او پیز پر کوئی عمل درآمد نہیں ہے اور انتظامیہ کی موجودگی کے باوجود اور انکی زیر نگرانی برسی منائی جارہی ہے اس بارے میں عوام کو مقامی انتظامیہ نے کرونا سے بچنے کیلئے احتیاطی تدابیر کا پابند نہیں کیا ہے جس سے باہر سے آنے والے ہندو عقدت مندوں کی ٹیسٹ وغیرہ بھی نہیں کیجا رہی ملکی حالات کے پیش نظر آنے والے زائرین کی کوائف بھی چیک نہیں ہورہی ہیں جبکہ جھل مگسی سٹی میں کل سے جیپ ریس بھی ہورہی ہے آج سے ریسر ٹریک پر روڈ لگا رہے ہیں بڑے نامور ریسر جھل مگسی میں پہنچ چکے ہیں اور وزیر اعلی بلوچستان دیگر اہم شخصیات بھی جھل مگسی میں موجود ہیں وہاں بھی ملک کے مختلف حصوں سے جیپ ریس دیکھنے کیلئے ملک کے مختلف حصوں سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں پہنچ رہے ہیں اور لوگوں کے آنے کا سلسلہ بھی جاری ہے ضلع جھل مگسی دو تحصیلوں پر مشتمل ہے دونوں تحصیلوں میں دو پروگرام جھل مگسی سٹی میں جیپ ریس اور گنداواہ میں برسی ایک ہی تاریخ سے شروع ہوئے پھر اختتام پذیر بھی ایک ہی تاریخ کو ہونگے ملک میں عالمی وباء کرونا کی جراثیم خطرناک ہوتے ہیں بلوچستان آبادی کے لحاظ سے کم آبادی والا ضلع جھل مگسی ہے حالانکہ جھل مگسی واحد ضلع ہے جہاں کرونا سے کوئی ایک شخص بھی متاثر نہیں ہوا تو اس صورت حال میں یقینی بات ہے کہ کرونا وبا پھیل سکتی ہے اور دوسری موضی امراض کی پھیلنے کا اندیشہ ہے خود حکومت بار بار اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ عالمی وبا پھیلنے کے قوی امکانات ہیں مگر جھل مگسی میں اہم شخصیات کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے لوگ ضلع جھل مگسی میں پہنچ گئے اور آنے کا سلسلہ بدستور جاری ہے مقامی انتظامیہ کی جانب سے ایس او پیز کے حوالے سے عالمی وباء کی پھیلنے کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا ہے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے اس کا جواب تو خود حکومت کے پاس ہے عوام کو احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کی اشد ضرورت ہے حالانکہ کرونا وائرس کی پھیلاؤ سے پوری دنیا میں ایک ہیجان، اضطراب اور بے یقینی بے چینی پھیلی ہوئی ہے کاروبار بند مزدوری بند۔ عبادت گائیں مساجد میں باجماعت نماز پر پابندی یکجا ہوکر قرآن پڑھنے پر بھی پابندی اجتماعات پر پابندی، مارکیٹیں، بازار، تعلیمی ادارے اور سوشل کلبز بند کردیئے گئے پوری دنیا کی حکومتیں اس وبا کی روک تھام اور اس کے نقصانات کو محدود کرنے کے لیے اپنی بھرپور کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہماری حکومت بھی اس وبا سے بچے اور اس وبا کو محدود کرنے کیلئے کافی کوشش کررہی ہے مگر کہیں حکومت لاعلمی یا دانستہ طور کوئی پابندی نہیں اور نہ ہی احتیاطی تدابیر پر عمل درآمد ہورہا ہے۔ اب تک اس وائرس سے لاکھوں انسان متاثر ہوگئے ہیں اور ہزاروں لقمہ اجل بن گئے ہیں۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اس موذی مرض سے بچاؤ کے لیے کئی تدابیر سوچی جارہی ہیں لوگوں کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک بلاضرورت آزادانہ نقل وحرکت کو محدود کیا گیا ہے۔ بلوچستان کی صوبائی حکومت کی طرف سے ناکافی اقدامات اور غیر تسلی بخش طریقہ کار کی وجہ سے شدید تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ سندھ حکومت کے علاوہ عالمی نشریاتی اداروں بی بی سی الجزیرہ اور گارڈین نے بھی کئی سنجیدہ سوالات اُٹھائے ہیں۔ مگر اس دوران صوبائی حکومت نے کئی قابل ستائش

اقدامات بھی اٹھائے ہیں۔جن میں صوبے بھر میں تمام شاپنگ مال مارکیٹیں اور تفریحی مقامات پر پابندی عائد کر رکھی ہے ضلع جھل مگسی میں کوئی پابندی نظر نہیں آ رہی ہے۔

پاکستان تحریک انصاف بلوچستان کے نائب صدر صدیق خان ترین نے بین الاقوامی گلوبل ٹائمز میڈیا یورپ کے ساتھ ایک اخباری بیان میں کہا کہ عوام سے مطالبہ ہے کہ کرونا وائرس کے خاتمے کیلئے احتیاطی تدابیر پر عمل کریں تا کہ کرونا وائرس کا خاتمہ ہو سکے کرونا وائرس وبا نے اس وقت پوری انسانیت کو خطرے میں دھکیل دیا ہے جو انسانیت کیلئے خطرہ ہوسکتا ہے عوام کو اس وقت حکومتی تدابیر اختیار کرنے کی اشد ضرورت ہے تدابیر پر عمل کرے بغیر کرونا وائرس سے نجات ناممکن ہے مگر اپنے صوبے کی حکومت سے کوئی مطالبہ نہیں۔حالانکہ بلوچستان حکومت میں پی ٹی آئی شریک ہے پنجاب میں لاہور کے علاقے رائے ونڈ میں شروع ہونے والا تبلیغی اجتماع گزشتہ اجتماعات کی نسبت قدرے مختلف ہے۔

لاہور کی ضلعی انتظامیہ کے مطابق رواں برس ہونے والے اجتماع کو عالمی وبا کرونا وائرس کے باعث محدود کیا گیا ہے۔ جب کہ اس سال بیرون ملک سے زائرین بھی شریک نہیں ہوسکیں گے۔

رائے ونڈ میں ہر سال تبلیغی جماعت کے اجتماع میں شرکت کے لیے پاکستان بھر سے لوگ لاہور آتے ہیں۔تاہم رواں برس کرونا وائرس کی وجہ سے اجتماع کو محدود کیا گیا ہے۔قواعد وضوابط کے مطابق منتظمین اجتماع میں ماسک کے استعمال اور سماجی فاصلے کو یقینی بنائیں گے اور تبلیغی اجتماع میں صفائی ستھرائی کا خصوصی انتظام کیا جائے گا۔

قواعد وضوابط کے مطابق اجتماع گاہ میں سونے کے لیے بستروں کے درمیان فاصلہ رکھا جائے گا۔شرکا آپس میں بھی چار فٹ کے فاصلے پر بیٹھیں گے۔اجتماع کے پنڈال کو چاروں طرف سے بند رکھا گیا ہے۔اجتماع کے اختتام پر شرکا کا ایک ساتھ نکلنا منع ہوگا۔

کرونا کی دوسری لہر اور

ٹاپ ٹرینڈ (ایس آر ایم نیوز) سے، covid 19 سے جہاں پوری دنیا میں لاکھوں افراد اس کا شکار بنے وہیں اس عالمی وباء نے دنیا کی بڑی بڑی معیشتوں تو زمین بوس کر دیا اور عالمی سطح پر غربت و بے روزگاری کی شرح میں اضافے کا بھی باعث بنی۔

اس وبا نے پاکستان میں بھی ہزاروں افراد لقمہ اجل بنے اور ہماری ملکی معیشت کا دھڑن تختہ ہوگیا۔

عمران حکومت کو سیاسی حلقوں میں سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا مگر عمران حکومت نے بہت محتاط اور دوررس پالیسی کو نافذ کرتے ہوئے سمارٹ لاک ڈاون سے دیہاڑی دار طبقہ کیلئے آسانی فراہم کی بلکہ احساس پروگرام کے ذریعے لاکھوں غریب اور متوسط خاندانوں کو شفاف طریقہ سے اربوں روپے کی امداد انکی دہلیز پر پہنچایا کووڈ 19 دوسری لہر ہے اور یہ پہلے سے زیادہ خطرناک بتائی جا رہی ہے موجودہ صورتحال کی سنگینی سے ڈاکٹر بھی خاموش ہیں وجہ معلوم نہیں خاموشی کیوں ہے افسوسناک بات یہ ہے کہ اسوقت سیاسی درجہ حرارت بہت زیادہ ہے اور کرونا ایس او پیز پر عملدرآمد کروانے کیلئے حکومت اور اپوزیشن کے رہنما ٹاک شوز اور سیاسی محفلوں میں آمنے سامنے مقابلہ میں ہیں۔ضلع جھل مگسی بلوچستان میں جیپ ریلی اور ہندوؤں کی مذہبی برسی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامل ہو رہے ہیں نہ کوئی احتیاطی تدابیر ہے نہ فاصلہ ہے نہ کوئی صفائی ہے اور نہ کوئی پابندی ہے اگر اس میں ضلع کے عوام میں کوئی بھی موذی مرض یا وباء پھیل جائے تو یہ قصور عوام کا ہے اور مقامی انتظامیہ کا ہے مگر عوام کو چاہئے کہ اپنی صحت اپنے بچوں کی صحت کے ذمہ دار خود ہیں اور خود پر خود پابندیاں لگائیں حکومتی احتیاطی تدابیر اختیار کریں تا کہ عالمی وباء ضلع جھل مگسی میں پھیل نہ سکے۔

فرح پہلوی: کیا ہزاروں ڈالر مالیت کا ریشمی لباس ایران کی آخری ملکہ کا ہی ہے؟

جرمنی میں واقع ہرمن ہسٹوریکا نامی معروف نیلام گھر نے ریشم کے اُس لباس کو 8800 ڈالرز کی کم سے کم قیمت کے عوض نیلامی کے لیے پیش کیا ہے جس کے بارے میں اُن کا دعویٰ ہے کہ یہ ایران کی آخری ملکہ فرح پہلوی کی ملکیت تھا۔

ایران کی آخری ملکہ نے اِس لباس کے بارے میں وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لباس شاید اُس لباس کا اصل ورژن ہے جو انھوں نے برسوں پہلے کسی کو تحفتاً دے دیا تھا۔ کچھ عرصہ قبل فرح پہلوی نے بی بی سی کو بتایا تھا کہ آکشن میں پیش کیے جانے والا ریشمی جوڑا وہ اپنے ہمراہ ایران سے نکلتے ہوئے ساتھ نہیں لائی تھیں۔ تاہم بعدازاں انھوں نے بی بی سی کو آگاہ کیا کہ ان کی ایک دوست نے انھیں یاد کروایا ہے کہ نیلام شدہ لباس شاید اس ریشمی لباس کا اصل ورژن تھا جو وہ ایران میں ہی چھوڑ آئی تھیں۔ فرح پہلوی کے مطابق انھیں یاد ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے کڑھائی والا ریشمی جوڑا زیب تن کیا تھا تاہم بعد میں انھیں مشرقی یورپ سے تعلق رکھنے والی ایک نوجوان لڑکی کا خط موصول ہوا تھا جو اُس لباس کو دیکھ کر مسحور ہو گئی تھی۔ ایران کی آخری ملکہ نے بتایا کہ انھوں نے اپنا وہ ڈریس اس لڑکی کو تحفتاً بھیج دیا تھا تاکہ وہ اسے اپنی شادی کے جوڑے کے طور پر پہنے۔ فرح پہلوی کے مطابق اس کے بعد انھوں نے اسی طرح کا ایک اور جوڑا مگر تھوڑے مختلف ڈیزائن میں تیار کروایا تھا۔ دوسری جانب نیلام گھر ہرمن ہسٹوریکا کا کہنا ہے کہ ان کے پاس سنہ 1975 میں تحریر کیا گیا ایرانی سفارتخانے کا وہ خط موجود ہے جس نے ریشم کے لباس کے مستند ہونے کی تصدیق کی گئی تھی۔ ہرمن ہسٹوریکا نے اس لباس کی تصاویر شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرح پہلوی اس لباس کا استعمال اہم تاریخی تقاریب میں کیا جیسا کہ امریکہ کے اس وقت کے صدر رچرڈ نیکسن سے ہونے والی ملاقات میں۔ تاہم ہرمن ہسٹوریکا کی ویب سائٹ پر دی گئی تفصیلات کے برعکس اس لباس کی سلائی فرانس میں نہیں کی گئی تھی۔ اس لباس کا آئیڈیا، جو ایرانی فیبرک اور جدید ڈیزائن کا امتزاج ہے، ایران کی دستکاری سے متاثر ہو کر فرح پہلوی نے کیوان خسروانی کے حوالے کیا تھا۔ اس پر ہونے والی کڑھائی کا کام مہتاب نوروزی نے کیا جنھوں نے اس وقت کے رائج فیشن یعنی سیاہ اور سرخ رنگ کے دھاگوں کے استعمال کے بجائے نیلے اور سنہرے دھاگے استعمال کیے۔ مہتاب نوروزی کا انتقال آٹھ برس قبل ہو چکا ہے۔ اپنے بہت سے مشہور کپڑوں میں فرح پہلوی نے ایرانی دستکاری کا استعمال کیا جبکہ اُن پر ہونے والی سوئی دھاگے کے کام میں نمایاں سیستان اور بلوچستان میں بننے والے ڈیزائن تھے۔ جرمنی میں واقع ہرمن ہسٹوریکا انسٹیٹیوٹ، جو بیش قیمت قدیم اشیا کی نیلامی کرنے کے حوالے سے جانا جاتا ہے، کی ایک حالیہ نیلامی بھی تنازع کا شکار ہو گئی تھی۔ اس نیلامی میں ایڈولف ہٹلر کا ایک ہیٹ (ٹوپی) اور ان کی اہلیہ ایوا براؤن کے ذاتی سامان کی نیلامی کی گئی تھی۔

متعدد یہودی تنظیموں نے اس پر یہ کہتے ہوئے احتجاج کیا کہ اس نیلامی کا مطلب کسی ایسے شخص کی عزت افزائی کرنا ہے جس کو یورپ کی تاریخ کی 'سب سے نفرت انگیز سیاسی شخصیت اور جنگی مجرم' کہا جاتا ہے۔

اس ادارے نے 19 ویں صدی کے ایک امریکی سپاہی کے تمغے بھی نیلام کیے تھے جس پر امریکہ کے مختلف سیاسی رہنماؤں نے احتجاج کیا تھا۔

ایران میں رہ جانے والے ملبوسات

ایران کی آخری ملکہ نے چند برس قبل بی بی سی فارسی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اپنے کچھ ایرانی ملبوسات ایران میں ہی چھوڑ آئیں تھیں کیونکہ اُن کا کہنا تھا کہ 'میں اپنے وجود کا ایک حصہ محل میں ہی چھوڑ دینا چاہتی تھی'۔ دو سال پہلے فرح پہلوی کے ملبوسات اور ذاتی سامان کی ایک نمائش تہران کے سعد آباد پیلس میں ہونا تھی تاہم مختلف وجوہات کی بنا پر اسے منسوخ کر دیا گیا تھا۔ فرح پہلوی کے چند ملبوسات فرانس کے مشہور ڈیزائنرز جیسا کہ کرسچین ڈائیر اور سینٹ لورینٹ نے بنائے تھے۔ فرح دیبا پہلوی کی شادی شاہ ایران محمد رضا پہلوی سے 20 برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ ان کی شادی کا جوڑا بھی فرانسیسی ڈیزائنر سینٹ لورینٹ نے تیار کیا تھا۔

جانوروں کی سمگلنگ سے متعلق پانچ عجیب وغریب واقعات

جرمنی میں ایئرپورٹ پر کسٹمز افسران نے حال ہی میں 26 ایسے نایاب ریپٹائلز یعنی رینگنے والے جانوروں کی میکسیکو سے سمگلنگ کو ناکام بنایا ہے۔

دنیا بھر میں سمگلنگ کے واقعات سے متعلق خبریں تو روز ہی اخبارات کی زینت بنتی ہیں لیکن ان میں سے کچھ خبریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ اسے بھی سمگل کیا جا سکتا ہے۔ دنیا بھر میں ایئرپورٹس، بندرگاہوں اور زمینی سرحدوں پر سمگلنگ کی روک تھام کے لیے کسٹمز حکام سامان کی مختلف آلات کے ذریعے تلاشی لیتے ہیں لیکن کئی سمگلر پھر بھی انھیں چکما دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ایسا کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ نایاب جانوروں یا ان کی کھالوں کو سمگل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ یہ خاصی خطیر رقم میں فروخت ہو جاتے ہیں۔ ایسے کئی انوکھے اور منفرد واقعات ماضی میں بھی ہو چکے ہیں تو آیئے نظر ڈالتے ہیں سمگل ہونے والی پانچ عجیب وغریب اشیا پر۔

جرمنی میں ریپٹائلز (رینگنے والے جانوروں) کی میکسیکو سے سمگلنگ

نومبر میں جرمنی میں ایئرپورٹ پر کسٹمز افسران نے 26 ایسے نایاب ریپٹائلز یعنی رینگنے والے جانوروں کی میکسیکو سے سمگلنگ کو ناکام بنایا ہے۔ ان رینگنے والے جانوروں میں 10 مردہ حالت میں کھلونوں اور ٹافیوں کے لفافوں میں پائے گئے۔

کولون بون ایئرپورٹ کے کسٹمز حکام کی جانب سے سامنے آنے والے بیان کے مطابق ان میں سے مردہ حالت میں پائے جانے والے جانوروں میں سے اکثر کی ہلاکت دم گھٹنے سے ہوئی جنھیں کپڑے کی گڑیاؤں میں سیا گیا تھا۔ ان میں معدومیت کا شکار جانور جیسے ہورنڈ چھپکلی، ایلیگیٹر چھپکلی، اور باکس کچھوے شامل ہیں اور انھیں جرمنی میں موجود تاجروں کے پاس جانا تھا۔

امریکہ میں شیر کے بچے کو سمگل کرنے کی کوشش

تین برس قبل امریکی ریاست کیلی فورنیا میں ایک نوجوان کو شیر کے ایک بچے کو میکسیکو سے امریکہ میں سمگل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ لوئس کواوٹے میسا کی سرحد پر علی الصبح سرحد کراس کرتے وقت پکڑا گیا تھا۔ امریکہ میں محکمہ وائلڈ لائف سروس کے حکام نے اس بنگالی نسل کے شیر کے بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ تمام نسل کے شیر قانونی طور محفوظ نسل کے جانوروں کی فہرست میں شامل ہیں اور ایسے کسی بھی جانور کو امریکہ میں لانے کے لیے اجازت لینا ضروری ہوتا ہے۔

پلاسٹک کی بوتلوں سے نایاب طوطے برآمد

گذشتہ ماہ انڈونیشیا کے مشرقی علاقے پاپوا میں بندرگاہ پر کھڑے ایک بحری جہاز سے پلاسٹک کی بوتلوں میں بند درجنوں سمگل شدہ طوطے ملے ہیں۔ پولیس کا کہنا تھا کہ عملے نے ایک بڑے ڈبے سے آوازیں آنے کے بعد 64 زندہ جبکہ 10 مردہ طوطوں کو برآمد کیا ہے

جنھیں پلاسٹک کی بوتلوں میں بند کیا گیا تھا۔ براعظم ایشیا میں پرندوں کی نسل کی معدومیت کا سب سے زیادہ خطرہ انڈونیشیا میں ہے اور یہاں پر پرندوں کی غیر قانونی تجارت بھی سب سے زیادہ ہے۔ پرندوں کو ملک کے اندر پرندوں کے بازاروں میں بیچا جاتا ہے یا انھیں بیرون ملک سمگل کیا جاتا ہے۔

بیس کروڑ روپے مالیت کے باز سمگل کرنے کی کوشش

رواں برس اکتوبر میں پاکستان میں حکام نے معدومیت کا شکار ہونے والے باز پرندوں کو ملک سے باہر سمگل کرنے کی ایک کوشش ناکام بنادی ہے۔ خیال کیا جارہا ہے کہ سمگل کیے جانے کی اس کوشش میں جن پرندوں کو ملک سے باہر لے جایا جارہا تھا ان کی بلیک مارکیٹ میں قیمت 20 کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ پاکستان کسٹمز کے کلیکٹر محمد ساقب کا کہنا ہے کہ یہ پرندے ناپید ہونے والے جانور کی فہرست میں شامل ہیں اور انھیں افغانستان سے عرب ممالک میں لے جایا جارہا تھا۔ مشرق وسطیٰ کے متعدد ممالک میں پرندوں کی مدد سے شکار کھیلنا مقبول ہے۔ خبر رساں ادارے روئٹرز کے مطابق 74 بازوں کو پکڑا گیا ہے تاہم اے ایف پی کے مطابق پکڑے گئے بازوں کی تعداد 75 ہے اور ان کے ساتھ ایک تلور بھی تھا۔ تلور ایک صحرائی پرندا ہے جس کا شکار شمالی افریقہ میں کیا جاتا ہے۔

کراچی سے گدھوں کی چار ہزار کھالیں چین سمگل کرنے کی کوشش

تین برس قبل کراچی میں کسٹم حکام نے شہر میں کی جانے والی ایک کارروائی کے دوران گدھوں کی چار ہزار کھالیں قبضے میں لی تھیں۔ حکام کا کہنا تھا کہ ان کھالوں کو غیر قانونی طور پر چین بھیجا جانا تھا۔ خیال رہے کہ چین میں گدھوں کی کھال کا کاروبار خاصا منافع بخش سمجھا جاتا ہے۔ چین میں ان کھالوں کو مختلف قسم کی کریمیں بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جو بہت مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ اس قسم کے واقعات بے شمار ہیں چند مثالیں یہ ہیں۔

آغا خان: سر سلطان محمد سے شہزادہ کریم تک، اسماعیلی برادری کے خاندانِ اوّل کی دلچسپ تاریخ

تحریر: عقیل عباس جعفری محقق و مورخ، کراچی

’مجھے پورا یقین ہے کہ شیعہ مسلم کمیونٹی کے بہترین مفاد میں یہ ہوگا کہ میرا جانشین کوئی ایسا نوجوان ہو جس کی پرورش اور تربیت حالیہ برسوں میں نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہوئی ہو اور جو امام کے منصب کو ایک نیا رُخ دینے کا اہل ہو۔ اس وجہ سے اگرچہ وہ میرا براہ راست وارث نہیں ہے، میں اپنے پوتے کریم کو، جو میرے بیٹے علی کا بیٹا ہے، آغا خان کا خطاب استعمال کرنے کا حق دیتا ہوں اور اپنے تمام پیروکاروں کا امام اور پیر مقرر کرتا ہوں۔‘

سر سلطان محمد آغا خان سوم کی آخری وصیت میں موجود یہ الفاظ تھے جن کی بدولت سنہ 1958 میں ان کے پوتے کریم کو اپنے والد شہزادہ علی خان کے بجائے موروثی پیشوا اور اسماعیلی برادری کا روحانی سربراہ مقرر کیا گیا۔ 13 دسمبر کو ان کی سالگرہ کے موقع پر شہزادہ کریم آغا خان کو نہ صرف اسماعیلی برادری بلکہ پوری دنیا بہت عقیدت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے فلاحی کاموں اور مفادِ عامہ کے لیے قائم کیے گئے اداروں کی وجہ سے دنیا بھر میں جانے جاتے ہیں۔ لیکن 1950 کی دہائی میں یہ پوری دنیا کے لیے ایک حیرانی کی بات تھی کہ آغا خان سوم نے اپنے بیٹے کے بجائے پوتے کو جانشین مقرر کر دیا۔ عام تصور یہ تھا کہ اگر علی خان نہیں تو پھر ان کے بھائی صدرالدین کو اگلا آغا خان مقرر کیا جائے گا۔ اسماعیلی برادری کا ماننا ہے کہ ان کے امام کا شجرۂ نسب براہ راست پیغمبرِ اسلام سے ملتا ہے تاہم اسماعیلی مسلمانوں کی امامت کا سلسلہ امام جعفر صادق کے بعد شیعہ اثنا عشری مسلمانوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ شیعہ اثنا عشری جعفر صادق کے بعد ان کے فرزند موسیٰ کاظم اور ان کی اولاد کی امامت کے قائل ہیں جبکہ اسماعیلی مسلمان جعفر صادق کے بڑے فرزند اسماعیل بن جعفر (جن کی وفات امام جعفر صادقؑ کی زندگی میں ہوگئی تھی) کو اپنے آٹھویں امام کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی اولاد کو سلسلہ وار اپنا امام مانتے ہیں۔ تو کیا وجہ بنی کہ سر سلطان محمد نے اپنے پوتے کو اپنے دونوں بیٹوں پر فوقیت دی؟ یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم آغا خان خاندان کی تاریخ سے واقف ہو جائیں۔ اس مضمون کو مرتب کرنے کے لیے ہم نے دیگر تاریخی ذریعوں کے علاوہ دو اہم کتابوں سے رہنمائی حاصل کی ہے: آغا خان سوم کی اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب ’دی میموائرز آف آغا خان: ورلڈ اِنف اینڈ ٹائم‘ اور مہر بوس کی ’دی آغا خانز‘، جس کا حمید اختر نے اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

سر سلطان محمد آغا خان سوم

سر سلطان محمد اسماعیلی مسلمانوں کے 48 ویں امام ہی نہیں بلکہ تحریک پاکستان کے ایک فعال رہنما بھی تھے۔ وہ دو نومبر 1877 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے

والد آغا خان دوم علی شاہ کی وفات کے بعد سنہ 1885 میں منصب امامت پر فائز ہوئے اور سنہ 1957 میں جب ان کی وفات ہوئی تو ان کا دور امامت تمام اسماعیلی اماموں سے زیادہ تھا۔ وہ سابق فاطمی سلطنت مصر میں اسوان کے مقام پر دریائے نیل کے کنارے مدفون ہیں۔ بین الاقوامی سیاست میں بھی ان کا اہم کردار تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک تھے اور سنہ 1907 سے سنہ 1913 تک اس کی صدارت پر فائز رہے تھے۔ ان ہی کی کوششوں سے ایم اے او کالج علی گڑھ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا اور وہ اس یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بھی رہے۔ سنہ 1930 میں جب لندن میں گول میز کانفرنسوں کا آغاز ہوا تو سر آغا خان نے وہاں بھی برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کی اور سنہ 1937 میں انھیں اقوامِ متحدہ کی پیشرو تنظیم لیگ آف نیشنز کی جنرل اسمبلی کا صدر بھی منتخب کیا گیا۔ سر آغا خان سوم نے چار شادیاں کی تھیں۔ ان کے سب سے بڑے فرزند کا نام مہدی تھا جو اگر زندہ رہتے تو ان کے جانشین ہوتے۔ ان کے دوسرے فرزند شہزادہ علی خان تھے جو 13 جون 1911 کو پیدا ہوئے۔

’پلے بوائے‘ شہزادہ

پرنس علی خان یورپ میں اپنی کاک ٹیل پارٹیوں اور معاشقوں کی وجہ سے شہرت

پاتے جا رہے تھے۔ انھیں الکوحل سے رغبت نہیں تھی نہ ہی وہ اپنے والد کی طرح کھانے کے شوقین تھے، مگر وہ اپنے مہمانوں کو ہر طرح مطمئن اور مسرور رکھنے کے فن سے آگاہ تھے۔ انھیں اپنے معاشقوں کے کھلے بندوں ہونے والے تذکروں کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ عیش وعشرت اور ہنگامے برپا کرنے میں مصروف اور خوش رہتے تھے اسی سبب سے ان پر پلے بوائے کا لیبل چسپاں ہو گیا تھا۔ شادی کے معاملات میں سر آغا خان سوم بھی خاصے معروف تھے مگر علی خان ان سے بھی بازی لے گئے تھے۔ اگرچہ آغا خان سوم کی زندگی میں آنے والی خواتین کا خاندانی لحاظ سے برتر ہونا ضروری نہیں تھا مگر علی خان سے تعلق رکھنے والی بیشتر عورتیں مغربی دنیا کی منتخب حسینائیں تھیں اور اپنے اپنے شعبوں میں شہرت رکھتی تھیں۔ سنہ 1936 میں 21 سال کی عمر میں شہزادہ علی خان کی شادی جون باربرا یاردے بلر نامی ایک انگریز خاتون سے ہوئی جو عمر میں ان سے تین سال بڑی تھیں۔ اس سے قبل جون کی تھامس لوئل گنس نامی شخص سے شادی ہوئی تھی جن کا خاندان گنس کے نام سے شراب بنانی والی ایک بہت بڑی کمپنی کا مالک تھا۔ اس شادی کے نتیجے میں ان کے دو بیٹے کریم اور امین پیدا ہوئے مگر پرنس علی خان ایک ڈال پر ٹھکانہ بنانے والے کہاں تھے۔ جلد ہی ان کے اور جون باربرا یاردے کے درمیان اختلافات رونما ہونے لگے۔ پہلا اختلاف تو یہی ہوا کہ جون نے کریم اور امین کو سوئٹزرلینڈ میں اعلیٰ تعلیم دلانا چاہی اور اس مقصد کے لیے جس سکول میں دونوں بیٹوں کو داخل کروایا گیا وہاں تکبر، روپے پیسے کی برتری اور اعلیٰ سماجی حیثیت کو بنیادی مقام حاصل تھا۔ اس سکول کے طالب علموں میں شاہ ایران، اٹلی کے معزول بادشاہ کے صاحبزادے اور متنازع خطاب رکھنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے بچے شامل تھے۔ علی خان اور جون یاردے کی شادی سنہ 1949 تک جاری رہی اور طلاق کے وقت شہزادہ علی نے جون کو 15 لاکھ پاؤنڈ کی رقم ادا کی۔ جون نے بھی ایک اچھی بیوی کا کردار نبھایا اور طلاق کے معاملے میں آخر تک تعاون پر آمادہ رہیں۔ انھوں نے خود اس طلاق کی بڑی وجہ علی کی عدم توجہی کو قرار دیا۔

حقیقی زندگی میں شہزادی بننے والی پہلی ہالی وڈ اداکارہ

علی خان کی زندگی میں آنے والی جس حسینہ کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ ہالی وڈ کی اداکارہ اور 1940 کی دہائی میں بڑی سکرین پر راج کرنے والی ریٹا ہیورتھ تھیں، جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ شہزادہ علی نے ریٹا ہیورتھ کو پہلی مرتبہ فلم 'بلڈ اینڈ سینڈ' میں دیکھا تھا اور وہیں سے وہ ریٹا کے عشق میں گرفتار ہوئے۔ ان دنوں ریٹا مشہور ہالی وڈ اداکار اور ہدایتکار اورسن ویلیز کی بیوی تھیں اور اس شادی سے ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ چند ماہ بعد جب کان فلم فیسٹیول میں علی خان اور ریٹا کی پہلی ملاقات ہوئی تو ریٹا بھی ان کے عشق میں گرفتار ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور بہت جلد اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر لی۔ علی خان اور ریٹا ہیورتھ کو دنیا بھر میں اخبارات کی توجہ کا مرکز بن گئے اور وہ جہاں جاتے، پاپارازی فوٹو گرافران کا پیچھا کرتے اور پریس رپورٹرز ایسی خبریں تلاش کرتے جسے مصالحہ لگا کر وہ اپنے قارئین کے سامنے پیش کر سکیں۔ اخبارات نے شہزادہ علی کو 'پرنس چارمنگ' اور ریٹا ہیورتھ کو 'سنڈریلا' کا خطاب دے رکھا تھا۔ اس صورتحال میں آغا خان سوم نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو ریٹا سے شادی کر لیں تاکہ ان کی نجی زندگی، جو مسلسل سکینڈلز کا شکار تھی، پرسکون ہو سکے۔ آغا خان نے یہ بات اخباری نمائندوں کے سامنے بھی کی، انھوں نے ریٹا کی بہت تعریف کی اور ان کو ایک انتہائی دلکش خاتون قرار دیتے ہوئے اخبارات سے اپیل کی کہ وہ اس معاملے کو غیر ضروری طور پر اچھالنے سے گریز کریں۔ آغا خان سوم نے اخبار نویسوں سے یہاں تک کہا کہ برطانیہ میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ طلاقیں ہوتی ہیں مگر ہر شخص میرے ہی بیٹے کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ علی خان نے والد کے مشورے پر عمل کیا اور 27 مئی 1949 کو ریٹا ہیورتھ سے بہت دھوم دھام سے شادی کی۔ اس تقریب کو پیرس کی مسجد کے امام نے بیسویں صدی کی اہم ترین اسلامی شادی قرار دیا۔ شادی کے وقت ریٹا نے ہیرے کی 32 قیراط وزنی انگوٹھی پہنی ہوئی تھی اور ان ہاتھ کے کنگن اور بالیاں بھی ہیروں کی تھیں۔ ان کے بالوں میں بھی ہیرے کا جڑاؤ کنگھا آویزاں تھا۔ علی خان بھی زرد رنگ کا ڈبل بریسٹ سوٹ پہنے بہت حسین لگ رہے تھے۔ اس شادی میں مہمانوں کو شیمپین کی چھ سو بوتلیں اور ایک سو بیس پاؤنڈ وزنی کیک پیش کیا گیا۔ اس شادی کے نتیجے میں شہزادے کے ہاں ایک بیٹی یاسمین پیدا ہوئی۔

ریٹا اس وقت بڑی سکرین کی دیوی تصور کی جاتی تھیں لیکن انھیں یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی کہ علی خان کے پیروکار انھیں بھی ایک دیوتا کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ ریٹا اداکاری کا سلسلہ بھی جاری رکھنا چاہتی تھیں مگر علی خان اور ان کے لاکھوں پیروکار ذہنی طور پر اس بات کے لیے آمادہ نہ تھے۔ ریٹا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک ایسی دنیا کا حصہ بن چکی ہے جہاں انھیں دیوی کا درجہ تو دیا جا سکتا ہے مگر ایک عام عورت کا نہیں۔ یہ بات بھی ان سے چھپی نہ رہی کہ علی خان ابھی امام نہیں بنے اور ان کے بعد محض اتنی ہی دولت ہے جتنی انھیں اپنے والد کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔ ریٹا نے پھر علی خان سے طلاق حاصل کرنے کی کوششیں شروع کیں اور ایک شب، جب علی خان مصر اور ان کے والد ہندوستان میں تھے، وہ اپنی بیٹیوں ربیکا اور یاسمین کے ہمراہ پیرس سے نکل کر امریکہ پہنچ گئیں۔ علی خان ریٹا کو منانے امریکہ پہنچے اور ابتدا میں دنوں کے تعلقات بحال

ہونے کے آثار نظر آنے لگے تاہم ریٹا اداکاری کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئیں اور سنہ 1953 میں یہ شادی طلاق پر ختم ہوئی۔

شہزادے کا صدمہ اور پاکستان کے لیے خدمات

علی خان اور ریٹا ہیورتھ کی طلاق کے بعد بھی شہزادے کے معاشقوں کی داستانیں منظر عام پر آتی رہیں۔ اسی زمانے میں خبر آئی کہ سر آغا خان علی کے بجائے اپنے چھوٹے بیٹے صدرالدین کو اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں، مگر صدرالدین کی شخصیت بھی علی خان سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی۔ 25 مئی 1955 کو سر آغا خان سوم نے اپنی وصیت تیار کی جس کی توثیق 18 جون 1957 کو کی گئی۔ یہ وصیت خفیہ رکھی گئی اور سر آغا خان کی وفات کے اگلے روز 12 جولائی 1957 کو کھولی گئی۔ وصیت میں لکھا تھا کہ جانشین کا انتخاب امام کا حق ہے اور وہ اپنے وارثوں میں سے کسی کو بھی چننے کا قطعی اور ناقابل چیلنج حق رکھتے ہیں۔ اسی وصیت میں آغا خان سوم نے اپنے پوتے کریم کو جانشین مقرر کیا اور ان کے تمام پیروکاروں نے ان کی خواہش کی پاسداری کی اور شہزادہ کریم کو اپنا امام تسلیم کرلیا۔ اُدھر علی خان کے لیے دنیا بدل چکی تھی۔ جانشینی سے محرومی ان کے لیے شدید صدمے کا باعث تھی اور انھیں کبھی یہ گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے والد انھیں اپنا جانشین نامزد نہیں کریں گے۔ تاہم انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھالا اور نومبر 1957 میں انھوں نے پاکستان کے صدر اسکندر مرزا سے ملاقات کی، جنھوں نے علی خان کو اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے کے طور پر خدمات سرانجام دینے کی پیشکش کی۔ اس ذمہ داری کا رسمی اعلان چھ فروری 1958 کو کراچی میں شہزادہ کریم آغا خان کی رسم تاج پوشی کی تقریب کے دو ہفتے بعد ہوا۔ ابتدا میں پاکستانی اخبارات نے اس فیصلے پر کڑی نکتہ چینی کی، مگر حقیقت یہ ہے کہ علی خان کی اس منصب پر تقرری نے اقوام متحدہ جیسے ادارے میں پاکستان کے مفادات کو بے حد فائدہ پہنچایا۔ آخر شہزادہ علی ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت تھے اور دنیا بھر کے مدبرین ان کی بات توجہ سے سنتے تھے۔ ستمبر 1959 میں شہزادہ علی خان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مطابق الجزائر کی جدوجہد آزادی کی حمایت کی۔ ان کے اس موقف سے فرانس، جہاں کے وہ عملاً شہری تھے، سخت ناراض ہوا۔ کچھ عرصہ بعد حکومت پاکستان نے پرنس علی خان کو ارجنٹینا میں پاکستان کا سفیر نامزد کیا مگر اس سے قبل کہ وہ اپنا یہ منصب سنبھالتے، وہ 12 مئی 1960 کو پیرس میں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

آغا خان چہارم اور فلاحی خدمات

آغا خان سوم کی وفات کے بعد دنیا بھر میں شہزادہ کریم کی تخت نشینی کی رسومات شروع ہوئیں اور 23 جنوری 1958 کو کراچی میں بھی پرنس کریم آغا خان کی رسم تخت نشینی ادا کی گئی۔ اس طرح شہزادہ کریم آغا خانی یا اسماعیلی مسلمانوں کے 49 ویں امام بنے اور آغا خان چہارم کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔ یہ تقریب نیشنل سٹیڈیم میں منعقد ہوئی جس میں صدر اسکندر مرزا اور وزیر اعظم فیروز خان نون نے بھی شرکت کی۔ تقریب میں شہزادہ کریم آغا خان کے تقریباً ڈیڑھ لاکھ پیروکار بھی موجود تھے۔ کریم آغا خان 13 دسمبر 1936 کو سوئٹزرلینڈ کے شہر جینوا میں پیدا ہوئے تھے۔ کسی مخصوص قطعہ زمین پر تسلط نہ رکھنے کے باوجود وہ ایک ایسے حکمران ثابت ہوئے جو اپنے پیروکاروں کے دلوں پر راج کرتے ہیں اور ان کی ہدایات حرف آخر سمجھی جاتی ہے۔

سنہ 1969 میں پرنس کریم آغا خان نے ایک انگریز خاتون سے شادی کرلی جن کا اسلامی نام سلیمہ رکھا گیا۔ اس شادی کے مہمانوں میں برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ، ہالینڈ کی شہزادی برن ہارڈ اور ایران کے شہزادے اشرف پہلوی بھی شامل تھے۔ سلیمہ سے شہزادہ کریم آغا خان کے تین بچے ہوئے: زہرہ آغا خان، رحیم آغا خان اور حسین آغا خان۔ شادی کے 26 سال بعد سنہ 1995 میں دونوں کے درمیان طلاق ہوگئی۔ سنہ 1998 میں کریم آغا خان نے دوسری شادی انارا نامی خاتون سے کی جن سے ایک بیٹا علی محمد آغا خان پیدا ہوا، مگر چند سال بعد سنہ 2011 میں ان کی انارا سے بھی طلاق ہو گئی۔ پرنس کریم آغا خان دنیا بھر کے لوگوں کے مالی، علمی اور صحت کے امور میں مدد کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے ہیں۔ انھوں نے منصب امامت سنبھالنے کے بعد آغا خان ڈیولپمنٹ نیٹ ورک کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور رفاہی کاموں کے ایک طویل سلسلے کا آغاز کیا جو دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ ادارہ دنیا کے تقریباً 35 ممالک میں غربت اور انسانی زندگی کا معیار بہتر بنانے میں مصروف عمل ہے۔ آغا خان ڈیولپمنٹ نیٹ ورک کے ذیلی اداروں میں آغا خان فاؤنڈیشن، آغا خان ہیلتھ سروسز، آغا خان پلاننگ اینڈ بلڈنگ سروسز، آغا خان اکنامک سروسز اور آغا خان ایجنسی فار مائیکروفنانس شامل ہیں جن کی نگرانی شہزادہ کریم آغا خان خود کرتے ہیں۔ انھوں نے فن تعمیر کے فروغ کے لیے آغا خان آرکیٹیکچر ایوارڈ کا سلسلہ بھی شروع کیا جس سے دنیا بھر میں اسلامی فن تعمیر کو بڑا فروغ ملا۔ ان کے قائم کردہ ادارے آغا خان فاؤنڈیشن نے کراچی میں ایک بڑا ہسپتال اور میڈیکل یونیورسٹی قائم کی جو ملک میں اپنی طرز کی منفرد درسگاہ ہے۔ اس ہسپتال اور یونیورسٹی کا ڈیزائن امریکہ کی آرکیٹیکچرل فرم پیٹی انٹرنیشنل نے تیار کیا تھا۔

آغا خان فاؤنڈیشن نے پاکستان کے شمالی علاقہ جات گلگت بلتستان کی ترقی میں بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سنہ 1980 میں آغا خان فاؤنڈیشن نے اس خطے میں آغا خان رورل سپورٹ پروگرام، آغا خان ہیلتھ سروسز اور دیگر فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی جو آج بھی اس علاقے کی ترقی اور خوش حالی میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ آغا خان چہارم کو مختلف ممالک نے متعدد اعزازات اور خطابات سے بھی سرفراز کیا: انھیں 20 ممالک نے اپنے قومی اعزازات سے نوازا ہے اور دنیا کی 19 بہترین یونیورسٹیوں نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ انھیں جو اعزازات عطا ہوئے ہیں ان میں حکومت برطانیہ کی جانب سے 'ہز ہائی نس' کا خطاب اور 'نائٹ کمانڈر آف دی برٹش امپائر' کا اعزاز، کینیڈا کی اعزازی شہریت، امریکی اکیڈمی برائے آرٹ اینڈ سائنسز کی فیلوشپ اور حکومت پاکستان کی جانب سے نشان امتیاز کا اعزاز شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا چارٹر 1948: پاکستان کا کردار کیا تھا؟

تحریر: ابونائل

دس دسمبر کا دن دنیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس روز اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کے چارٹر کا اعلان کیا تھا۔ یہ اعلامیہ صدر روزویلٹ کی اہلیہ الینوار روزویلٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی نے تیار کیا تھا۔ 10 دسمبر 1948 کو جنرل اسمبلی نے اس کو کثرت رائے سے منظور کرلیا تھا۔ 10 دسمبر کو اس بارے میں مکرمہ ڈاکٹر طاہرہ کاظمی صاحبہ کا ایک معلوماتی کالم (ہم سب پر) شائع ہوا۔ اس چارٹر کی تیاری میں پاکستان نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ جو کمیٹی اس چارٹر کو تیار کر رہی تھی اس میں پاکستان کی نمائندگی پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب کر رہے تھے۔ جیسا کہ اس قسم کی اہم دستاویزات تیار کرتے ہوئے معمول ہے، اس کی تیاری کے دوران کئی نکات پر اختلافات بھی پیدا ہوئے تھے اور ان کے بارے میں مختلف ممالک نے اپنی اپنی رائے کا اظہار اپنے ووٹوں سے کیا تھا۔ ان میں سے ایک اہم اختلاف کا ذکر کرنا ضروری ہے جو کہ اس وقت پیدا ہوا جب جنرل اسمبلی میں سوویت یونین نے اس چارٹر میں کچھ ترامیم پیش کیں۔ اس چارٹر میں یہ شق موجود تھی کہ اس چارٹر میں جو حقوق بیان کئے ہیں وہ ان لوگوں کو بھی حاصل ہوں گے جنہیں اپنی حکومت چلانے کا اختیار نہیں ہے۔ یعنی وہ علاقے جو ابھی آزاد نہیں تھے وہ برطانیہ یا فرانس یا کسی اور یوروپی ملک کے تحت تھے۔ مثال کے طور پر افریقی ممالک میں کینیا، یوگینڈا، گیمبیا، تنزانیہ، بوٹسوانہ، نائیجیریا، سیرالیون، کیمرون، گیبن، زمبابوے، زیمبیا، مڈغاسکر اور سینیگال، برکینا فاسو اور نائجر ابھی آزاد نہیں ہوئے تھے۔ عرب ممالک میں لیبیا، مراکش، تیونس، قطر، بحرین اور کویت ابھی محکوم تھے۔ ایشیائی ممالک میں ماریشس اور ملیشیا نے بھی ابھی آزادی کی منزل حاصل نہیں کی تھی۔ اس صورت حال میں ایک تضاد تھا۔ اور وہ یہ کہ انسانی حقوق کے چارٹر کی پہلی شق ہی یہ تھی کہ سب انسان پیدائشی طور پر آزاد ہیں اور حقوق اور وقار میں برابر ہیں۔ اور ایک اور شق یہ تھی کہ کسی کو غلام یا محکوم نہیں بنایا جا سکتا۔ اور دوسری طرف دنیا کے کئی ممالک کو سیاسی آزادی بھی حاصل نہ ہو اور وہ کسی اور ملک کے محکوم کی حیثیت رکھتے ہوں۔ یہ تو ایک کھلا تضاد تھا۔ لیکن عالمی سطح پر بھی ایسے تضادات کو مصلحتوں کی دیوی کے اشاروں پر قبول کرلیا جاتا ہے۔ اس موقع پر سوویت یونین کی طرف سے اس تضاد کو دور کرنے کے لئے ایک اہم ترمیم پیش کی گئی۔ اور وہ ترمیم یہ تھی:

"تمام لوگوں اور تمام اقوام کو قومی طور پر حق خود اختیاری حاصل ہے۔ وہ حکومتیں جو ایسے علاقوں کا انتظام کر رہی ہیں جن کے لوگوں کو اپنے علاقوں پر حکومت کا اختیار نہیں ہے، اقوام متحدہ کے اصولوں اور مقاصد سے راہنمائی حاصل کرتے ہوئے ان علاقوں کے لوگوں کو یہ حق دلانے کے لئے سہولت مہیا کریں گی۔۔۔"

سوویت یونین نے اس کے علاوہ اور ترامیم بھی پیش کی تھیں لیکن جیسا کہ اس ترمیم کے الفاظ واضح کر رہے ہیں یہ ترمیم سب سے زیادہ اہم تھی کیونکہ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ جو ممالک اس وقت تک بہت سے ممالک کو محکوم بنائے ہوئے تھے، اب انہیں ان محکوم ممالک کو آزادی دینے کا عمل شروع کرنا ہوگا۔ اس ترمیم کے حق میں تقریر کرتے ہوئے سوویت یونین کے نمائندے نے اس بات پر زور دیا کہ انسانی حقوق کے چارٹر میں حق خود اختیاری کے اہم حق کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ بہر حال جب 10 دسمبر 1948 کو جنرل اسمبلی میں اس ترمیم پر ووٹنگ ہوئی تو اس ترمیم کے حق میں صرف 8 ووٹ پڑے اور حیران کن بات یہ ہے کہ اس ترمیم کے خلاف 34 ووٹ ڈالے گئے اور 14 ممالک نے غیر جانبدار رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ جن ممالک نے سوویت یونین کی ترمیم کے حق میں ووٹ ڈالے ان میں سوویت یونین، بیلوروس، یوکرین، چیکوسلاویکیا، پولینڈ، یوگوسلاویا، کولمبیا تو شامل تھے لیکن یہ بات ہماری تاریخ کا قابل فخر حصہ ہے کہ پاکستان نے اس ترمیم کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ برطانیہ اور فرانس تو اس وقت بہت سے ممالک پر قابض تھے۔ اس لئے انہوں نے تو اس ترمیم کے خلاف ووٹ دیا۔ ان کے علاوہ دنیا میں آزادی اور جمہوریت کا سب سے زیادہ ڈھول پیٹنے والے امریکہ نے بھی اس ترمیم کے خلاف ووٹ دیا۔ اور یہ بات حیرانی میں ڈالتی ہے کہ آزادی اور سوشلزم کے اتنے بھاشن دینے کے باوجود بھارت نے اس ترمیم کے خلاف ووٹ دیا تھا۔ مسلمان ممالک میں سے صرف پاکستان نے اس تجویز کی حمایت کی تھی۔ ایران ترکی اور شام نے تو اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ اور اس ووٹنگ میں افغانستان مصر عراق اور سعودی عرب غیر جانبدار رہے تھے۔ یہ ایک اور حیرانی کی بات ہے کیونکہ اس تجویز کے منظور ہونے کی صورت میں کئی مسلمان ممالک کی آزادی کے عمل نے تیز ہو جانا تھا۔ اس ووٹنگ کی تفصیلات 10 دسمبر 1948 کی جنرل اسمبلی کی کارروائی کے صفحہ 930 پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس اہم روز کی کارروائی میں پاکستان کا موقف متوازن تھا کیونکہ پاکستان نے سوویت یونین کی چار ترامیم میں سے دو کے حق میں ووٹ دیا تھا اور دو کے خلاف ووٹ دیا تھا۔

شعبہ انٹرنیشنل

ابراہام لنکن اور جوزف بائیڈن کا مشکلات بھرا سفر

تحریر: زکریا ورک

امریکہ کے 16 ویں صدر ابراہام لنکن (65-1809) اور 46 ویں صدر میں بعض مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔

ابراہام لنکن کو زندگی میں جن صدموں، ناکامیوں اور تلخیوں سے دوچار ہونا پڑا اس کی مختصر روداد یہاں پیش کی جاتی ہے۔ ابراہام لنکن کی پیدائش غریب والدین کے یہاں لاگ کیبن میں ہوئی تھی۔ لنکن جب صرف نو سال کا تھا تو اس کی والدہ نینسی راہی ملک عدم ہوگئی۔ جب وہ انیس سال کا تھا تو اس کی بہن سارہ بچے کی ولادت کے دوران فوت ہوگئی۔ والدہ کی وفات کے بعد سارہ نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ ابراہام نے خود کتابیں پڑھ کر تعلیم حاصل کی اور وکیل بن گیا۔ 1862 میں اس کی شادی میری ٹاڈ Mary Todd سے ہوئی۔ ابراہام لنکن ایک شفیق اور مہربان خاوند تھا۔ شادی کے موقعہ پر جو انگوٹھی بیوی کو دی اس پر لکھا ہوا تھا: Love is Eternal

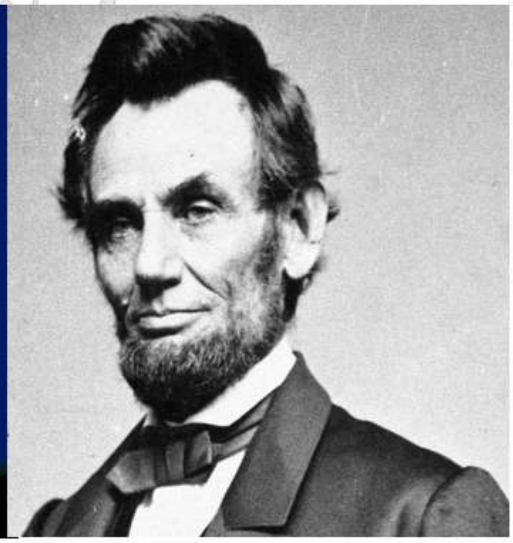

اس کے یہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔ پہلا بیٹا رابرٹ لنکن تھا جس کی پیدائش 1863 میں ہوئی اور 82 سال کی عمر میں 1926 میں وفات پائی۔ ایڈورڈ کی پیدائش 1846 میں ہوئی اور چار سال کی عمر 1850 میں وفات پا گیا۔ ولی لنکن Willie Lincoln کی پیدائش دسمبر 1850 میں ہوئی اور فروری 1862 کو وائٹ ہاؤس میں وفات پا گیا۔ سب سے چھوٹے بیٹے ٹامس کی پیدائش 1853 میں ہوئی اور اٹھارہ سال کی عمر میں جولائی 1871 میں وفات پا گیا۔

مارچ 1832 میں ہوئی ابراہام نے پہلا الیکشن لڑا تو شکست سے دوچار ہوا۔ 1834 میں وہ الیکشن جیت گیا اور چار دفعہ ایلی نائیس ریاستی اسمبلی کر ممبر رہا۔ 1843 میں اس نے کانگریس کے لئے الیکشن لڑا مگر شکست کھا گیا۔ 1846 میں اس نے الیکشن جیت لیا اور 49-1847 کانگریس کا ممبر رہا۔ 1860 میں اس نے صدر امریکہ کے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیاب رہا۔ چار سال بعد وہ دوبارہ صدر منتخب ہوا مگر اس کے بعد صرف ایک سال زندہ رہا۔ سیاہ فاموں کی غلامی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے پر اس کو کسی سفاک نے 14 اپریل 1865 میں گولی کا نشانہ بنا دیا جب فورڈ تھیٹر واشنگٹن میں ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔

جوزف بائیڈن

جب بائیڈن زندگی کے 29 زینوں پر قدم رکھ چکا تو اس وقت وہ امریکہ کی سینیٹ میں کم عمر ترین سینیٹر ڈیلاویئر ریاست سے نومبر 1972 میں منتخب ہوا تھا۔ اس سال ہی امریکی صدر نکسن نے دوسری بار الیکشن جیتا تھا۔ یہ الیکشن بائیڈن نے صرف تین ہزار ووٹ سے جیتا تھا۔ اس کے ایک ماہ بعد دسمبر 1972 میں بائیڈن اپنی بہن ویلری کے ساتھ واشنگٹن گیا تا اپنے دفتر کے ملازمین کا انتخاب کر سکے۔ اس دوران اس کی بیوی اور تین بچے (ناعومی عمر ایک سال، بو عمر چار سال اور ہنٹر عمر دو سال) گھر پر رہے۔ 18 دسمبر 1972 کو اس کی بیوی نیلیا Neilia اپنے بچوں کے ساتھ گھر سے ایک میل دور کرسمس شاپنگ کے لئے جا رہی تھی کہ ایک ٹریکٹر ٹریلر نے اس کی کار کو پیچھے سے ٹکر مار دی۔ نیلیا اور ناعومی Naomi اس حادثے میں موت کا شکار ہوگئیں جب کہ دو بیٹوں کو ہسپتال میں داخل کرایا گیا جو شدید زخمی ہوئے تھے۔ بائیڈن اور اس کی بہن فوراً اطلاع ملتے ہی ڈلاویئر واپس آ گئے۔ اس اندوہ ناک حادثے کے بعد بائیڈن کے دل میں خودکشی کا خیال آیا تھا۔ بطور سینیٹر کے اس نے حلف ہسپتال میں بچوں کے بیڈ کے پاس اٹھایا تھا۔ زندگی کے اس ناگہانی موڑ پر سینیٹر بائیڈن نے سوچنا شروع کیا کہ آیا اس کو سینیٹر کے عہدے سے استعفیٰ دے دینا چاہئے کیونکہ وطن عزیز ایک اور سینیٹر تو حاصل کر لے گا مگر اس کے دو چھوٹے راج دلارے آنکھوں کے تارے، ننھے منے بچوں کو باپ کی ضرورت تھی۔ امریکی سینیٹ

میں اس کے دونوں پارٹیوں ڈیموکریٹ اور ری پبلکن ممبران اس کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ ماہ کے بعد فیصلہ کرے۔ ری پبلکن پارٹی کے ممبران نے اس کو تسلی دی کہ اگر وہ کسی وقت سینیٹ سے غیر حاضر ہوا تو وہ ووٹنگ نہیں کریں گے اگر کسی ایمرجنسی میں اس کو بچوں کے پاس گھر واپس جانا پڑا جو مہلک حادثے کے اثرات سے بری طرح متاثر تھے۔ اس لئے بائیڈن سینیٹ میں دونوں پارٹیوں کے سینیٹرز کا ہمیشہ ممنون احسان رہا۔ بائیڈن ایک باعمل خدا پرست اور پارسا کیتھولک ہے جو اکثر جیب میں رکھی تسبیح پر ورد کرتا رہتا ہے۔ اس نے زندگی بھر کبھی بھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ ایک بار اس نے شراب Gin گلاس میں انڈیل کر کچن کاؤنٹر پر رکھ دی مگر اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کو لبوں تک لے جائے۔ حادثے کے بعد بائیڈن اکثر اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر کار اس نے کون سا گناہ کیا ہے کہ جس کی اس کو سزا ملی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سینیٹ کا اجلاس جاری ہوتا تھا تو وہ ہر شام کو ٹرین Amtrack لے کر واشنگٹن سے ڈلاویئر بچوں کی نگہداشت کے لئے آجاتا تھا۔ اس آنے جانے میں اس کو تین گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اس سفر کے دوران مسافر اس سے قدر مانوس ہو گئے تھے کہ وہ اس کی پہچان Amtrack Biden کے نام سے کرنے لگ گئے تھے۔ بعض اوقات وہ اس قدر مایوس ہو جاتا کہ ڈپریشن کی حالت میں اس کا جی کرتا کہ وہ چلتی ٹرین سے کود جائے۔ مگر پھر یک لخت اس کو بچوں کا خیال آجاتا جو گھر پر اس کے انتظار کر رہے ہوتے تھے۔ ٹرین کا یہ سفر اس کی زندگی کا حصہ بن گیا حتی کہ 1988 میں جب اس نے پہلی بار صدر امریکہ کا الیکشن لڑنے کا اعلان کیا تو یہ اعلان اس نے ٹرین سٹیشن سے کیا تھا۔

خوش قسمتی سے اس کی ملاقات انگلش ٹیچر جل سٹیون سن Jill Stevenson سے ہوگئی اور جلد ہی 1977 میں ان کی شادی ہوگئی۔ جل بائیڈن ابھی تک نارتھرن ورجینیا کمیونٹی کالج میں انگلش کی ٹیچر ہے اور جب جوزف بائیڈن جنوری 2121 میں صدر امریکہ کا حلف اٹھائیگا تو بھی اس کا ارادہ ہے کہ وہ ٹیچنگ کرتی رہے گی۔ جب اس کا شوہر باراک اوبامہ کا وائس پرزیڈنٹ تھا تو اس وقت بھی سکرٹ سروس اس کی حفاظت پر معمور تھی۔ ڈاکٹر جل بائیڈن چار ڈگریوں اور ایک ڈاکٹریٹ کی حامل ہے جو اس نے خود اپنی محنت لیاقت اور استعداد سے حاصل کی تھیں۔ جوزف بائیڈن کو اپنے بیٹے بو بائیڈن Beau Biden پر فخر حاصل تھا جو امریکی ریاست ڈیلاویئر کا اٹارنی جنرل منتخب ہوا تھا۔ جب وہ اٹارنی جنرل تھا تو اس نے امریکی فوج کے ساتھ ایک سال عراق میں جنگ کے دوران گزارا تھا۔ جرات اور دلیری کی بناء پر اس کو برونز میڈل سے نوازا گیا تھا۔ عراق سے واپس آنے کے بعد بھی اٹارنی جنرل رہا اور اس کا ارادہ تھا کہ ڈلاویئر ریاست کے گورنر کا الیکشن لڑے۔ بو بائیڈن نے یہ بات صاف کر دی تھی کہ سیاست میں خود راستہ بنائے گا جس کے لئے اس کو اپنے والد کے معروف نام، شہرت اور مدد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اس کو برین کینسر ہو گیا۔ کچھ مہینے تو یوں لگتا تھا کہ کینسر ری میشن میں چلا گیا ہے مگر واپس آ گیا اور 30 مئی 2015 کو داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ بیٹے نے باپ سے جو آخری بات کہی وہ یہ تھی:

He looked into my eyes and kept saying,

"Promise me Dad that you will be ok"

بو بائیڈن چاہتا تھا کہ اس کا باپ صدر کا الیکشن لڑے۔ بیٹے کی وفات کے بعد جوزف بائیڈن نفسیاتی طور پر چکنا چور ہو گیا تھا۔ ادھر ہلری کلنٹن صدر کے الیکشن کے امیدوار کے طور پر میدان میں اتر آئی۔ جب 2016 میں ٹرمپ جیت گیا تو بائیڈن اپنی اہلیہ کے ساتھ ڈلاویئر Delaware اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔ بائیڈن نے ڈیموکریٹک پارٹی کے صدارتی امیدوار کی نامزدگی کے لئے دو دفعہ (1988 & 2008) کوشش کی مگر دونوں دفعہ ناکام رہا۔ اور پھر کیا ہوا کہ شارلٹس وِل (ورجینیا) میں فسادات ہوئے جس میں سفید فام نیونازیز supermacists نے احتجاج کرنے والوں پر حملہ کر دیا جو چاہتے تھے کہ کنفڈریٹ جنرل رابرٹ لی Lee کا مجسمہ گرا دیا جائے۔ جب ایک سفید فام تشدد پسند نے لوگوں کے ہجوم پر کار دوڑا دی تو 12 اگست 2017 کو ایک 32 سالہ لڑکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور 19 زخمی ہو گئے۔ بائیڈن کو اس اندوہ ناک واقعہ سے سخت رنج ہوا۔ ملال اور رنجیدگی کی بات یہ نہیں تھی کہ سفید فام تشدد پسند ایسے نعرے لگا رہے تھے کہ Jews will not replace us بلکہ اس ہیبت ناک واقعہ پر ڈانلڈ ٹرمپ کا قابل مذمت ردعمل تھا جب اس نے ٹیلی ویژن پر کہا تھا there are fine people on both sides۔ بائیڈن نے صدر امریکہ کا یہ ردعمل دیکھا تو عین اس وقت، اسی لمحہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ 2020 میں ہونے والی صدارتی الیکشن میں ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار کے طور پر مقابلہ کرے گا۔ اس امید پر کہ وہ نہ صرف اپنے مرحوم بیٹے کی خواہش کو پورا کر سکے گا بلکہ امریکی عوام کو قریب لانے اور ان کو متحد کرنے کی تن من دھن سے پوری کوشش کرے گا۔ مسٹر ٹرمپ شاید اب سوچتا ہوگا کہ کاش اس نے یہ الفاظ نہ کہے ہوتے جو بائیڈن کو اس کے مقابل پر لے آئے اور اس کی شکست فاش پر منتج ہوئے۔ یاد رہے کہ words have consequences۔

امریکہ کے نئے منتخب صدر جوزف بائیڈن نے اپنی کتاب Promise me, Dad (2017) میں انکشاف کیا تھا کہ جب اس کے بیٹے

Beau Biden کو کینسر لاحق ہو گیا تھا تو وہ اس کے علاج کے لئے پیسے پیسے کا محتاج ہو گیا تھا۔ فرزند دلبند کے علاج کے لئے اس نے اپنے واحد اثاثے چار ہزار سکوئیر فٹ گھر کو اونے پونے داموں پر فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چونکہ بینک سے قرض لینے کی شرائط بہت سخت تھیں اس لئے قرض لینا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر اس پر طرفہ یہ کہ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ مدت ملازمت ختم ہونے کے بعد بھی وہ قرض کی قسطیں ادا کر سکے۔ گھر کی فروخت کا معاہدہ قریب قریب تیار تھا کہ کسی طرح صدر اوبامہ کو اس امر کی اطلاع ہو گئی۔ انہوں نے بائیڈن کو اپنی طرف سے مدد کی رقم دے کر گھر کو فروخت ہونے سے بچا لیا۔ ابراہام لنکن کا سب سے اہم ذاتی وصف empathy تھا۔ یعنی gift of putting himself in place of others to see what they feel.

بچپن میں بھی وہ بہت شفیق و نرم دل انسان تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دفعہ وہ پیدل کہیں جا رہا تھا تو اس نے ایک جانور دلدل میں پھنسا دیکھا مگر بے توجہی کے عالم میں وہاں سے گزر گیا۔ جب وہ آدھا میل جا چکا تو واپس آیا اور جانور کو دلدل سے باہر نکالا۔ اس نے جانور کو باہر اس لئے نکالا تا وہ اسکے درد اور تکلیف کو اپنے ذہن سے نکال پھینکے۔

جوزف بائیڈن کے اوصاف میں سے سب سے بڑی اخلاقی قوت empathy ہے۔ وہ سیاست میں spirit of bipartisanship سے کام لیتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ "وہ (یعنی ری پبلکن) ہمارے مدمقابل ہیں نہ کہ ہمارے دشمن"۔ اوبامہ کے دور حکومت میں جب ڈیموکریٹ کا کنٹرول کانگریس پر ختم ہو گیا تو بائیڈن نے اپنے مدمقابل جان میک کین اور مچ میک نال کے تعاون سے کئی ایک قوانین پاس کروائے تھے۔ ویت نام جنگ کے ہیرو جان میک کین کی 30 اگست 2018 کو وفات پر بائیڈن نے کہا تھا: "میرا نام جو بائیڈن ہے۔ میں ایک ڈیموکریٹ ہوں اور میں جان میک کین سے بے پناہ محبت کرتا ہوں"۔ یہ بیان صدر ٹرمپ کے بیان سے ہزار گنا مختلف تھا جس نے کہا تھا I dont cosnider John McCain a war hero because he had not been killed but captured۔ یہ بات تعجب کی نہیں کہ جان میک کین کی وائف سنڈی میک کین Cindy McCain نے 2020 الیکشن کے دوران بائیڈن کی پرزور تائید کی تھی۔

❁❁❁

کل مذہب پوچھ کر بخش دی تھی جان میری
آج فرقہ پوچھ کر اس نے ہی لے لی جان میری.....
مت کرو رفع یدین پر اتنی بحث مسلمانو
نماز تو ان کی بھی ہوجاتی ہے جن کے ہاتھ نہیں ہوتے
تم ہاتھ باندھنے اور ہاتھ چھوڑنے پر بحث میں لگے رہو
اور دشمن تمہارے ہاتھ کاٹنے کی شازش میں لگے ہیں
زندگی کے فریب میں ہم نے ہزاروں سجدے قضا کر ڈالے
ہمارے جنّت کے سردار نے تو تیروں کی برسات میں بھی نماز قضا نہیں کی
سجدہ عشق ہو تو عبادت میں مزہ آتا ہے
خالی سجدوں میں تو دنیا ہی بسا کرتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ بس فرض ادا کرنا ہے
ایسا لگتا ہے کوئی قرض لیا ہو رب سے
تیرے سجدے کہیں تجھے کافر نہ کردیں
تو جھکتا کہیں اور ہے اور سوچتا کہیں اور ہے
کوئی جنّت کا طالب ہے تو کوئی غم سے پریشان ہے
ضرورت سجدہ کرواتی ہے عبادت کون کرتا ہے
کیا ہوا تیرے ماتھے پر ہے تو سجدے کا نشاں
کوئی ایسا سجدہ بھی کر جو چھوڑ جائے زمیں پر نشاں
پھر آج حق کیلئے جاں فدا کرے کوئی
وفا بھی جھوم اٹھے یوں وفا کرے کوئی
نماز چودہ سو سالوں سے انتظار میں ہے
کہ مجھے صحابہ کی طرح ادا کرے کوئی
اک خدا ہی تو ہے جو سجدوں میں مان جاتا ہے
ورنہ یہ انسان تو جان لے کر بھی راضی نہیں ہوتا
دے دی اذاں مسجدوں میں حی الصلوہ حی الفلاح
اور لکھدیا باہر تخت پر اندر نہ آئے فلاں اور فلاں.....
خوف ہوتا ہے شیطان کو بھی آج کے مسلمان کو دیکھ کر
نماز بھی پڑھتا ہے تو مسجد کا نام دیکھ کر
مسلمانوں کے ہر فرقے نے ایک دوسرے کو کافر کہا.....
اک کافر ہی ہے جو اس نے ہم سب کو مسلمان کہا.....

❁❁❁

کیا نوم چومسکی کی رائے پر غور ہوگا؟

تحریر: ڈاکٹر توصیف احمد خان

نوبل انعام یافتہ پروفیسر نوم چومسکی ویسے تو یہودی ہیں مگر* اپنی 92 سالہ زندگی کا بیشتر حصہ صہیونیت اور امریکی سامراج کی پالیسیوں کے خلاف جدوجہد میں گزارا۔ پروفیسر صاحب فلسطینیوں کے حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔

وہ Linguistic کے مضمون کے ماہر ہیں، سو سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ امریکا کی مشہور Arizona یونیورسٹی اور Massachusetts institute of technology کے پروفیسر امیریٹس ہیں مگر* امریکا میں ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے استحصالی کردار، امریکی میڈیا پر ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے مفادات کا تحفظ کرنے والے گروہ کی اجارہ داری اور ترقی پذیر ممالک کی ورلڈ آرڈر کے خلاف جدوجہد اور جمہوریت کے مسائل ان کے خصوصی مضامین ہیں۔ کراچی کی حبیب یونیورسٹی نے پروفیسر نوم چومسکی کا انفارمیشن ٹیکنالوجی نیٹ ورک پر ایک لیکچر کا اہتمام کیا۔* پروفیسر نوم چومسکی نے اس لیکچر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان سائنس سے دور ہوتا جارہا ہے اور مذہبی انتہا پسندی کا گھیرا وسیع ہورہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیمی نصاب میں سائنس کے ساتھ دنیا کے منظر نامہ کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اور جنوبی ایشیائی ممالک میں موجود جامعات کے لیے ضروری ہے کہ وہ منطقی تعلیمی نظام کو بچائیں اور دنیا کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھیں۔ پروفیسر نوم چومسکی نے اپنے لیکچر میں حالیہ امریکی انتخابات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ* دنیا کو چار بڑے خطرات کا سامنا ہے اور دنیا تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے۔ ان خطرات میں ایٹمی جنگ، مالیاتی بربادی، دنیا بھر میں جمہوریت کا انحطاط اور حالیہ کورونا وائرس کی وباء ہیں۔* انھوں نے امریکی جمہوریت پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ* امریکا میں اعشاریہ ایک فیصد طبقہ ملک کی پوری دولت کے 20 فیصد حصہ پر قابض ہے۔* جس بنیادی ڈھانچہ پر جمہوریت کام کرتی ہے وہ بری طرح متاثر ہوا ہے۔ امریکی معاشرے میں دولت کے ارتکاز سے ریاست کے مجموعی کردار پر حرف آتا ہے۔ پروفیسر نوم چومسکی نے پاکستان کے بارے میں جو تجزیہ کیا ہے وہ آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ سائنس سے مراد صرف سائنسی مضامین مثلاً فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی وغیرہ کی تدریس نہیں بلکہ سائنسی طرز فکر کے مطابق ریاست کی تشکیل ہے اور ایک ایسے معاشرے کا قیام جہاں ایک فرد رجعت پسندانہ سوچ کے بجائے سائنسی طرز فکر جس کی بنیاد منطق کے اصولوں کے مطابق ہو سوچتا اور عمل کرتا ہے۔ اس سال فروری میں جب کورونا وائرس نے پاکستان میں قدم رکھا تو ڈاکٹروں نے کورونا کے مرض کے علاج کے لیے طبی علوم کی کتابیں چھانٹنا شروع کیں تو واضح ہوا کہ کورونا طبی کتابوں میں موجود ہے اور سائنس دانوں نے اس مرض کو Covid-19 کہا ہے۔ طبی کتابوں سے پتہ چلا کہ گزشتہ صدی کی دوسری دہائی میں اسپین میں ایک فلو پھیلا تھا جو پہلے یورپ میں پھیل گیا، پھر امریکا اس فلو سے متاثر ہوا۔ صرف یورپ میں دو کروڑ کے قریب افراد جاں بحق ہوئے۔ برطانیہ کے فوجی دستے اسپینش فلو کے ساتھ ہندوستان آئے تھے اور اس فلو نے ایک خام اندازہ کے مطابق ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی جان لی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس وقت مریض کو تنہائی Isolation میں رکھنے اور سماجی فاصلہ Social Distance کا طریقہ استعمال کیا تھا اور Herd-Immunity پیدا ہونے سے اس مرض سے اموات کا سلسلہ بند ہوا تھا۔ سائنس دانوں نے اسپینش فلو کے وائرس پر تحقیق کی اور برسوں بعد نمونیا کی ویکسین تیار ہوئی۔ Antibiotic ادویات کی ایجاد سے فلو کے مریض صحتیاب ہوئے، یوں اس مارچ کے مہینہ میں ڈاکٹروں نے ماسک پہننے اور سماجی فاصلہ کا طریقہ کار وضع کیا۔ ڈاکٹروں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہجوم میں کورونا وائرس پھیلتا ہے۔ اس بناء پر لوگوں کو گھروں تک محدود کیا جائے، تمام تعلیمی، سرکاری، تجارتی ادارے اور مذہبی اداروں وغیرہ کو بند کردیا جائے۔ ماہرین نے اس سائنسی عمل کو لاک ڈاؤن کا نام دیا۔ طبی ماہرین کی تجویز پر سب سے پہلے سندھ حکومت نے توجہ دی، ہر شہری کو ماسک پہننے اور گھروں میں رہنے کی ہدایت کی گئی مگر وزیر اعظم عمران خان نے کہا کہ یہ معمولی فلو ہے جو وقت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ پنجاب کے گورنر چوہدری سرور نے کورونا سے بچنے کا ایک ٹوٹکہ ٹی وی پر بیان کیا۔ وزیر اعظم عمران خان خاصے دنوں تک ماسک پہننے پر آمادہ نہ ہوئے۔ تاجروں، سیاستدانوں اور علماء کرام نے لاک ڈاؤن کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ لاک ڈاؤن کے دوران مساجد میں سماجی فاصلے کی پرواہ نہیں کی گئی۔

پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں سازشی نظریہ گھڑا گیا اور یہ بات پورے ملک میں گردش کرگئی کہ کورونا کا مرض کچھ نہیں ہے اور یہ عالمی اداروں کی سازش ہے۔ یہاں تک پراپیگنڈا کیا گیا کہ ڈاکٹروں کو عالمی ادارہ صحت فنڈ دے رہا ہے، اس بناء پر ڈاکٹر ہر مریض کو کورونا کا مریض بتارہے ہیں حالانکہ اس کا ڈاکٹرز سے کوئی لینا دینا نہیں، کورونا ہے کہ نہیں، اس کا تعین لیبارٹری ٹیسٹ میں ہوتا ہے۔ اس پروپیگنڈہ سے صرف

ناخواندہ غریب لوگ ہی متاثر نہیں ہوئے بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ، دانشور، تاجر، سرکاری افسران، سیاستدان حتیٰ کے بعض ڈاکٹر حضرات بھی متاثر ہوئے۔ ڈاکٹرز میں دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم موجود ہے مگر اس طبی مسئلہ پر تمام ڈاکٹرز کی ایک رائے تھی۔ پاکستان میں ایسے طاقتور گروہ موجود ہیں، جو جھوٹ کو سچ بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ گروہ کبھی کسی مذہبی معاملے کو لے کر پراپگینڈا شروع کرتے ہیں، کبھی نسلی یا لسانیت کے پردے کے پیچھے متحرک ہوجاتے، پراپیگنڈا اتنا تیز اور شدید ہوتا کہ عام آدمی کی بات ہی چھوڑ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی یورپی ملک میں کوئی فرد توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن احتجاجی مظاہرے پاکستان میں شروع ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ حکومت اور اپوزیشن کے سیاستدان تک اس احتجاجی لہر کے دباؤ کے تحت بیانات جاری کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ہر سال عید کے تہوار پر تنازعہ کھڑا ہوتا ہے۔ رویت ہلال کمیٹی یوں تو آئینی ادارہ ہے مگر اس کے فیصلے کو خیبر پختون خواہ میں پشتو بیلٹ میں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ پھر شہادتوں کے کمزور نظام کی بناء پر کمیٹی کو واضح اعلان کرنے میں بہت تاخیر ہوتی ہے۔ سائنس وٹیکنالوجی کے وزیر فواد چوہدری نے چاند کی رویت کے مسئلہ کے حل کے لیے سائنسی طریقہ استعمال کرنے کی بات شروع کی مگر بعض علماء نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ حتیٰ کہ حکومت نے بھی اپنے وزیر کی تجویز پر توجہ نہیں دی۔ پاکستان دنیا کے تین ممالک میں شامل ہے جہاں پولیو کا مرض موجود ہے۔ صحت کی عالمی تنظیم W.H.O اور بچوں کے تحفظ کی بین الاقوامی تنظیم کے دباؤ پر 90 کی دہائی سے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے کی مہمیں چلائی جارہی ہیں مگر پولیو کا مرض ختم نہیں ہو پایا۔ ہر مہم کے دوران پولیو کے قطرے پلانے والے کئی کارکن شہید ہوجاتے ہیں۔ شہداء میں خواتین بھی شامل ہیں۔ رجعت پسند اس راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اگرچہ برسر اقتدار حکومتوں کی کوششوں سے علماء کا ایک بڑا حصہ اس مہم کی حمایت کرتا ہے مگر بعض عینی شاہدین کہتے ہیں کہ خیبر پختون خواہ اور بلوچستان کے پسماندہ علاقوں میں مذہبی طبقہ اس مہم کی حمایت نہیں کرتا۔ اس ملک کا ایک بڑا مسئلہ آبادی میں اضافہ ہے، اس کی بنیادی وجہ رجعت پسند ذہن ہے۔ بنگلہ دیش علماء کی کوششوں سے آبادی پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ *معروف ماہر سماجیات ڈاکٹر ریاض شیخ کہتے ہیں کہ صوبوں نے نصاب سے انتہاپسندی کو ختم کرنے کی کوشش کی مگر وفاق اس کوشش کو ناکام بنا رہا ہے، یوں نوجوانوں کو سائنسی طرزِ فکر سے دور کیا جارہا ہے۔ نوم چومسکی دنیا کے چند بڑے دانشوروں میں سے ایک ہیں، * کیا ان کی رائے پر صحیح غور ہوگا؟

❁❁❁

قتیل شفائی

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں
کس کو خبر تھی سانولے بادل بن برسے اڑ جاتے ہیں
ساون آیا لیکن اپنی قسمت میں برسات نہیں
ٹوٹ گیا جب دل تو پھر یہ سانس کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں
غم کے اندھیارے میں تجھ کو اپنا ساتھی کیوں سمجھوں
تو پھر تو ہے میرا تو سایہ بھی میرے ساتھ نہیں
مانا جیون میں عورت اک بار محبت کرتی ہے
لیکن مجھ کو یہ تو بتا دے کیا تو عورت ذات نہیں
ختم ہوا میرا فسانہ اب یہ آنسو پونچھ بھی لو
جس میں کوئی تارا چمکے آج کی رات وہ رات نہیں
میرے غمگیں ہونے پر احباب ہیں یوں حیران قتیلؔ
جیسے میں پتھر ہوں میرے سینے میں جذبات نہیں

☼☼☼

اشتہارات کے لیے

رسالہ ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں اپنے اشتہارات شائع کروا کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشہیر، مشہوریت کرسکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور انٹرنیشنل youTube چینل کا بھی آغاز ہوچکا ہے۔ تمام معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکریہ۔

http:www.youtube.com/channel/
UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

کچھ ذکر نادر شاہ افشار کا!

تحریر: ابوبکر شیخ

چاہت کا بیج کسی نہ کسی کیفیت میں ہر وجود میں اُگتا ہے۔ کہیں تنکے کی صورت میں تو کہیں جھاڑی کی صورت میں، مگر شاید ہی چاہت کا یہ بیج برگد کے پیڑ کی طرح اُگتا ہو۔ پھر یہ گھنی اور وسیع چاہت اس وجود کو رلا دیتی ہے کہ طلب کا وہ گھنا درخت جس پر تمناؤں کی ہزاروں چڑیائیں بستی ہیں ان کا شور اس کو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ہم یہاں مثبت اور منفی کی بحث میں نہیں پڑتے کہ اس پر بات کرنے سے طوالت کا اندیشہ ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ مثبت چاہت ہوگی تو تیر اور تلوار ساتھ میں نہیں ہوگی اور نہ شبِ خون کے ڈر سے جاگنا پڑے گا۔ لیکن اگر یہ چاہت منفی راستے کا انتخاب کرے گی تو اس چاہت سے 'ت' نکل جاتا ہے، اور 'زندان' اور 'کن' اس کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ گہرا نشیب کبھی مثبت عمل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو 'چاہ زندان' کا درد ہمارے سینوں میں کبھی نہیں ابلتا۔ آج کا یہ سفر کچھ زیادہ پرانے وقتوں کا تو نہیں ہے مگر طویل بہت ہے۔ یہ فاصلے ٹھنڈی اور سنگلاخ زمینوں سے شروع ہوتے ہیں اور تپتے اور گرم ریگزاروں تک آ پہنچتے ہیں۔ اگر ہم اس سفر کے راستے کو غور سے دیکھیں گے تو ہمیں بہت سے سنگ میل ملیں گے۔ اب ان کو ہم پڑھ سکتے ہیں یا نہیں وہ ہم پر منحصر ہے۔ مگر تاریخ کے اس کارواں میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ 21 مارچ 1739ء بمطابق 10 ذوالحجہ 1152ھ، ہفتے کا دن تھا۔ اسلامی تقویم کے مطابق عیدالاضحیٰ اور ایرانی کیلنڈر کے مطابق نوروز (نئے سال کا پہلا دن) تھا۔ عید کی نماز کے خطبے میں بادشاہ وقت کا نام 'نادر شاہ' پڑھا گیا۔ وقت کی بے رحمی اور شامت اعمال دیکھیے کہ سلطنتِ ہندوستان کا اصل مالک اور بادشاہ اس خطبے کو اپنے کانوں سے سن رہا تھا اور اپنی ہی مملکت میں ایک غلام کی حیثیت سے عید کے جلوس میں شامل تھا۔ اگر شمال مغرب سے آیا ہوا طاقت کا یہ غبار ان چوکھٹوں تک رک جاتا تو پھر بھی ایک کڑوے گھونٹ کی طرح حاکم پی لیتا۔ مگر یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ شکست و ریخت کی ذلتیں تو ابھی آنی باقی تھیں۔ اسی روز 'نوروز' کی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ شام کے وقت کچھ بیوپاریوں نے یہ افواہ پھیلائی کہ، نادر شاہ قتل کر دیا گیا ہے۔ ان افواہوں کی تصدیق نہیں کی گئی اور یہ خبریں دہلی کی گلیوں میں اس طرح پھیلیں جس طرح سوکھی گھاس کو دیا سلائی دکھانے کے بعد آگ پھیلتی ہے۔

یہ خبر سن کر قزلباش اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھے اور ہتھیار رکھنے والے لوگ نکڑوں پر اکٹھے ہو گئے اور ایک شورش کی شکل اختیار کر لی۔ غبار کسی بھی صورت و شکل میں ہو جب تک ایک لکیر کے دائرے میں رہے گا تب تک قابو میں رہے گا، اور جس پل اس لکیر کو پار کر گیا وہ کسی کے قابو میں نہیں رہتا۔ اس طرح شہر کی تنگ گلیوں میں سے گزرنے والے ایک یا 2 قزلباش، شورش پسندوں کے اچانک حملوں کا نشانہ بن کر قتل ہونے لگے۔ 'تاریخ شہادت فرخ سیر' کے مصنف محمد بخش آشوب، اس وقت اپنے گھر میں، جو کابلی دروازہ کے قریب تھا کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے یہ شور سن کر چھت پر جا کر دیکھا کہ سعادت خان کی سپاہ کے لوگ قزلباشوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں (سعادت خان اسی دن زہر خورانی کی وجہ سے نادر کی قید میں مرا تھا)۔ سعادت خان کے یہ سپاہی کابل اور پشاور سے آئے تھے اور جنگ کرنال کی شکست کا انتقام لینا چاہتے تھے۔

بہرحال اس جھڑپ میں 3 ہزار ایرانی سپاہیوں کو اپنی جان گنوانی پڑی۔ دوسری صبح جب نادر شاہ ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے نکلا تو راستے میں کسی گھر کی بالکونی سے ایک گولی چلی جس میں نادر تو بچ گیا مگر اس کا ایک عہدیدار مارا گیا۔ اس کے بعد کیا ہونا تھا؟ وہ ہی جو تخت اور پروٹوکول کے سحر میں جکڑے ہوئے بادشاہ کرتے ہیں۔ حکم ہوا کہ 'جس علاقہ میں ایک بھی قزلباش سپاہی مارا گیا ہے، وہاں کوئی بھی شہری زندہ نظر نہیں آنا چاہیے'۔

تاریخ کے اوراق پر جہاں ایرانی سپاہیوں کا خون بہتا نظر آتا ہے، وہاں بدلے میں 3 ہزار کی جگہ 20 ہزار لوگوں کا اس نادری حکم سے بہتا خون بھی ہمیں ان تنگ گلیوں میں بہتا اور سوکھتا نظر آتا ہے۔ اور یہ 20 ہزار سروں کو فقط چند گھنٹوں یعنی صبح سے شام تک باجرے کے سٹوں کی طرح کاٹ دیا گیا۔ جب تک اس قتال کا اختتام نہ ہوا نادر شاہ نے اپنی تلوار نیام میں نہیں ڈالی۔ پھر وقت آیا دہلی سے تاوان لینے کا۔ مختلف تحریروں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی کے امرا اور عوام سے زر و جواہر، بیش قیمت اشیا اور نقدی کی صورت میں کم از کم 70 کروڑ روپے حاصل ہوئے اور ساتھ میں طلائی تخت

طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی ہاتھ لگا۔ جہاں بادشاہ رنگیلے ہوں، ہر خیال کا مرکز جنس پر آ کر رک جائے، سُرور ملے تو نشے کی حالت میں سیدھا کھڑے رہنا معیوب لگے اور ڈگمگاتے قدم غرور بن جائیں وہاں ایسی صورتحال کا ہونا کسی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ مغل سلطنت کا یہ زمانہ اپنی آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ وسعت جب اپنے پھیلاؤ کی سرحد تک پہنچتی ہے تو اس کا بحال رکھنا کمال ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو زوال کی شامیں تھیں تو شام کی ٹھنڈک میں کمال کی بیل کیسے اُگتی؟ اتنا خون بہنے اور اتنی لوٹ مار کے بعد 12 مئی کو ایک 'بڑا دربار' منعقد کیا گیا۔ اس دربار کا احوال ہم 'تاریخ نادری' کے مرزا مہدی سے سنتے ہیں۔ 'اس دربار میں شہنشاہ اور اس کے امراء کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس دربار میں نادر شاہ نے اپنے ہاتھوں سے محمد شاہ کے سر پر ہندوستان کا تاج رکھا اور جواہرات سے جڑی ایک تلوار اور بیش قیمت طلائی کمر بند عطا کیا۔ شہنشاہ کے امرا کو بھی خلعت فاخرہ پیش کی گئیں۔ شہنشاہ ہند نے اپنی تاجوری کی بحالی پر اظہار تشکر کے طور پر دریائے سندھ کے مغربی کنارے کا تمام علاقہ نادر شاہ کی عملداری میں دینے کی پیشکش کی۔ یہ علاقہ تبت اور کشمیر کی سرحدوں سے لے کر دریائے سندھ کے بحیرۂ عرب میں اترنے تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں ٹھٹہ کے اضلاع، بندرگاہیں اور قلعے بھی شامل تھے۔'

گلیوں میں بہائے گئے خون کا خوف محمد شاہ کے رگوں میں بہتا تھا۔ اسے لوگوں کی بے وقت موت کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ خوف تھا تو اپنے تخت و تاج کا۔ تیموری خون میں وہ ابال جس کی وجہ سے وہ ہندوستان پر حکومت کر سکے تھے، سرخ ریشمی رنگوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ ان لوگوں کے خون پر کھڑے جب افشار نے اس کے سر پر تاج رکھا تو محمد شاہ رنگیلا نے اسے بڑا اعزاز سمجھا۔ مگر وقت کے قلم نے جو کیفیتیں تحریر کیں وہ شرمندگی، بیوقوفی اور ذلت کے سوا کچھ نہیں۔ 16 مئی 1739ء کو بالآخر کوچ کا اعلان ہوا۔ نادر شاہ عراقی گھوڑے پر بیٹھ کر دہلی کی گلیوں سے ہوتا ہوا کابلی دروازے سے نکلا۔ واپسی کا یہ منظر 'آشوب' نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اب ہمیں سنا رہے ہیں۔ وہ آگے تحریر کرتے ہیں کہ 'نادر نے سر پر ایک سرخ رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی جس پر قیمتی موتی جڑا تھا۔ ٹوپی کے گرد سفید کشمیری شال لپٹی تھی۔ وہ کڑیل جوان، تنومند اور سیدھی کمر کے ساتھ بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کو خضاب سے کالا کیا گیا تھا'۔

نادر جب چناب اور جہلم سے ہوتا پشاور پہنچا اور درہ خیبر کے راستے 2 دسمبر کو کابل پہنچا تو سندھ کے گورنر میاں نور محمد کو حکم بھیجا کہ وہ اس سے کابل میں آ کر ملے۔ مگر کلہوڑا حاکم نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ جس کے بعد شدید سردی میں 50 برس کا نادر 9 دسمبر کو سندھ کے لیے نکل پڑا۔ نادر کو سندھ پہنچتے پہنچتے 2 سے 3 ماہ تو ضرور لگ جائیں گے۔ ہم تب تک کلہوڑا حاکموں کے زمانے میں چل پڑتے ہیں کہ ان دنوں میں یہاں کے سیاسی حالات کیسے تھے۔ کلہوڑا خاندان کی حکومت کی بنیاد ہمیں 1657ء میں پڑتی نظر آتی ہے جب میاں نصیر محمد بن الیاس گدی نشین ہوا۔ میاں کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا میاں دین محمد مسند پر بیٹھا جسے اورنگزیب کے پوتے میاں معزالدین نے ملتان میں قتل کر دیا۔ اسی زمانے میں اورنگزیب کے آشیر باد سے اس کے بھائی 'یار محمد' کو بکھر اور سہیون کی زمینداری کی سند اور 'خدا یار خان' کا لقب ملا۔ مرکزی حکومت نے تخت نشینی کے لیے جو شرائط رکھی تھیں ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ 'ایران کی خبریں وہ دہلی سرکار کو پہنچاتا رہے گا'۔ تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ قندھار مغلوں اور ایرانیوں کے درمیان مسلسل تنازع کا سبب رہا۔ بابر نے اسے فتح کیا تھا، جب ہمایوں اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس لینے کے لیے سندھ سے ہوتا ہوا مدد لینے کے لیے ایران گیا تھا، تو اسے یہ شرط قبول کرنی پڑی تھی کہ 'قندھار ایران کے حوالے کیا جائے گا'۔ اکبر نے قندھار پر قبضہ کیا مگر جہانگیر کے زمانے میں یہ پھر مغلوں کے ہاتھوں سے پھسل گیا۔ شاہ جہاں نے اپنی حکومت میں 3 بار قندھار کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وقت کی بچھی ہوئی بساط پر وہ کامیابی کی کوئی چال نہ چل سکا۔ 1694ء میں 'شاہ حسین صفوی' ایران کا بادشاہ بنا۔ ایران کے صفوی خاندان کا زوال ان کی پالیسیوں کی وجہ سے ہوا۔ شاہی خاندان کے مرد حرم کی چار دیواری میں محبوس، امورِ سلطنت اور سیاسی بصیرت سے دُور، انہیں نہ امن کے معاملات کا علم ہوتا اور نہ جنگ کے امور سے آگاہی۔ 1720ء میں ترکی کا ایک نمائندہ 'دوری آفندی' تہران آیا، 3 ماہ کے بعد جب وہ ترکی لوٹا تو اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ سرسبز اور خوشحال ایران اب تیزی سے اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

انہی زمانوں میں ایران کا ساحل اور کرمان کا علاقہ بلوچ حملہ آوروں کی زد میں تھا۔ 1721ء کے اواخر میں قندھار کے 'ملک محمد غلزئی' ہمیں ایران پر حملہ کرتے نظر آتے ہیں، اور پھر ایران کے سیاسی منظرنامے میں نادر شاہ نظر آتا ہے۔ جس کے متعلق 'لاک ہارٹ' کے الفاظ ہیں کہ 'اگرچہ نادر شاہ کے مظالم اور تباہ کاریوں کو نظر انداز کرنا اور ان کا کوئی جواز پیش کرنا مشکل ہے، لیکن اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک عظیم آدمی تھا۔ اس کا ایک گڈریے سے بادشاہ بن جانا بلاشبہ ایک حیرت انگیز کامیابی تھی۔ لیکن نادر شاہ کے حوالے سے اہم بات یہ ہے کہ، اس نے ایران کو طاقتور دشمنوں سے آزاد کروایا'۔

میاں یار محمد کے خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دہلی سرکار نے اسے خبریں پہنچانے کی جو ذمہ داری دے رکھی تھی اس کو وہ اچھی طرح سے پورا کر رہا تھا۔ اس کے آخری وقت میں صوفی شاہ عنایت کی شہادت کا المیہ ہوا اور 1719ء میں میاں صاحب کی وفات کے بعد 13 نومبر 1719ء کو تخت پر اس کا بڑا بیٹا 'میاں نور محمد' بیٹھا، اور مرکز کو یقین دلایا کہ وہ ایرانی سرحدوں پر نگاہ رکھے گا اور ان کے متعلق خبریں ان کو بھیجتا

رہے گا۔ یہ وہ عرصہ تھا کہ جب محمد شاہ (رنگیلا) کو تخت پر بیٹھے 2 ماہ ہی گزرے تھے۔ اگر کسی کی نظر سے 'درگاہ قلی خان' کی تحریر کی گئی کتاب 'مرقع دہلی' گزری ہے تو اسے ضرور پتہ ہوگا کہ ان دنوں دہلی کے نکڑوں اور بازاروں میں کیسے کیسے رنگ بہتے تھے، جبکہ یہاں کلہوڑوں کی آپس میں جنگیں ہو رہی تھیں اور ساتھ میں بروہیوں سے بھی جنگیں جاری تھیں اور جب ان جنگوں میں جیت میاں نور محمد کی ہوئی تو وہ سندھ کے ایک مضبوط اور طاقتور حکمران کی حیثیت سے مانے گئے اور ان دنوں میں سندھ کا دارالخلافہ خدا آباد تھا جہاں کے باغات بڑے مشہور تھے۔ ننگر ٹھٹہ میں مغل دربار کا آخری نواب صادق علی خان تھا جس نے مرکز کی ہدایت کے مطابق 1737ء میں یہ علاقہ میاں نور محمد کے حوالے کر دیا۔ کابل سے سندھ کی طرف کا سفر انتہائی سخت تھا۔ خواجہ عبدالکریم منشی لکھتے ہیں 'اس سخت سرد موسم میں ہمیں 22 بار مختلف پانی کے بہاؤں سے گزرنا پڑا۔ بالآخر یکم شوال 1152ھ (یکم جنوری 1740ء) جمعہ کے دن فوج کرم کی سنگلاخ اور دشوار ترین گھاٹیوں سے نکل آئی اور فوجوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ راستے میں جن جن قبائل نے مقابلہ کیا وہ مارے گئے۔ ایک قبیلے میں ایک ہزار لوگ تھے اور مقابلے کے بعد ان میں سے فقط 2 آدمی بچے۔ ہمیں سب سے زیادہ پریشان ان جنگلوں نے کیا جو سندھ کی سرحدوں پر تھے۔ جن میں ہم کئی بار راستہ بھی بھولے، ان گھنے جنگلوں کے آگے مازندان اور طبرستان کے جنگل کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہمارا لشکر 5 جنوری کو ڈیرہ اسماعیل خان پہنچا۔ یہیں پر داؤد پوتہ قبیلے کا سردار صادق خان اطاعت کے لیے حاضر ہوا۔ اس نے خدا یار خان (میاں نور محمد) کے خلاف نادر کی مدد کا وعدہ کیا۔ 15 جنوری کو ڈیرہ غازی خان پہنچ کر، نادر نے میاں نور محمد کو پھر حاضر ہونے کے لیے طلب کیا مگر کلہوڑا سردار سے کوئی جواب نہیں ملا'۔

میاں نور محمد کو جب یہ یقین ہو گیا کہ نادر آن پہنچا ہے تو نادر کا مقابلہ کرنے کے بجائے، خدا آباد کو چھوڑ کر اپنا خاندان اور مال و متاع لے کر عمر کوٹ کی طرف سفر اختیار کیا۔ میاں کے ذہن میں اگر یہ تھا کہ نادر اتنا دُوران ریگزاروں میں نہیں آئے گا، تو وہ یقیناً غلط سوچ بیٹھا تھا۔ کیونکہ جو سردی کے سخت موسم میں کابل سے یہاں آ سکتا تھا اس کے آگے یہ سفر کچھ زیادہ سخت یا طویل نہیں تھا۔ میاں صاحب جب خدا آباد سے عمر کوٹ کے لیے نکلے تو حکم جاری کیا کہ وہ سامان جو نادر کی مدد کر سکے وہ جلا دیا جائے یا ایسے مقامات پر زمین میں دبا دیا جائے جہاں ایرانی لشکر کی نظر نہ پڑے۔ مگر یہ حکم جتنا سخت نظر آتا ہے، حقیقت میں بالکل اس کے برعکس ہوا۔ خوراک جہاں جہاں چھپائی گئی تھی وہ ایرانی لشکر کے نظر میں آ گئی۔ گندم اور جو کی بوائی ہو چکی تھی جو لشکر کے جانوروں کی اچھی خوراک ثابت ہوئی۔ اسی طرح حالات میاں صاحب کے لیے اچھے ثابت نہیں ہوئے۔ ایرانی لشکر 12 فروری کو لاڑکانہ پہنچا۔ یہاں نادر شاہ کو خبر ملی کہ خدا یار خان گجرات کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ یہ بات سنتے ہی وہ لاڑکانہ سے نکل پڑا اور شہداد پور پہنچا جہاں نادر کو خدا یار خان کی طرف سے تحائف کے ساتھ پناہ کی درخواست بھی موصول ہوئی۔ حالات اور واقعات جو تحریر کی حالت میں ہم تک پہنچے ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شہداد پور کے بعد ایک تو زمینی حالات نادر کے حق میں نہیں تھے، سردیاں ختم ہو رہی تھیں، ریگستانی علاقہ تھا، ایران کے دوسرے محاذ بھی کھلے تھے اور پانی کے راستے یعنی دریائے سندھ کے راستے بھی بڑی تعداد میں مدد ملنی مشکل تھی۔ نادر شاہ نے یہ سارے پہلو ضرور نظر میں رکھے ہوں گے، مگر 'انا' تو انا ہی ہے جس کا وجود ایک پیاسے ریگستان کی طرح ہر وقت سوکھا رہتا ہے۔ اس کی تشنگی کبھی کم نہیں ہوتی اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ انا کے اس ریگزار کو ہرا رکھے۔ اس کے لیے وہ ساری پریشانیاں اور ذلتیں اٹھا سکتا ہے۔ اگر انا کے یہ ریگزار نہ ہوتے تو نہ جنگوں کے میدان سجتے، نہ خون بہتا، نہ کوئی حاکم ہوتا اور نہ کوئی محکوم۔ مگر نہ ایسا ہے اور نہ ہوگا کہ جس مٹی سے انسان کا وجود گندھا ہے اس میں ان عناصر کو ساتھ میں گوندھا گیا ہے۔ 12 فروری کو نادر شہداد پور سے نکلا اور تیزی سے عمر کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ عمر کوٹ جہاں شہنشاہ اکبر کی ولادت ہوئی تھی۔ اس نے 90 میل یعنی 150 کلومیٹر کا فاصلہ اس تیزی سے طے کیا کہ اگلے روز وہ عمر کوٹ پہنچ چکا تھا۔ خواجہ عبدالکریم منشی لکھتے ہیں کہ 'میاں صاحب نے اپنا قیمتی سامان کشتیوں میں بھر دیا تھا اور خود بھی کشتی پر سوار ہو کر کسی اور جزیرے پر جانے کی تیاری میں تھا تب تک نادر شاہ پہنچ گیا۔ اس زمانے میں دریائے سندھ کے عمر کوٹ والے بہاؤ میں کشتیاں چلتی تھیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میاں نے اپنے اہل و عیال کو مارواڑ کی طرف بھیج دیا ہو اور خود بعد میں مال و متاع کشتیوں کے وسیلے بھیج رہا ہو۔ تب تک نادر آن پہنچا'۔ میاں صاحب نے پیش ہونے کے لیے شرط رکھی کہ 'اس کو اور اس کے خاندان کو کوئی گزند نہیں پہنچائی جائے گی'۔ عبدالکریم منشی لکھتے ہیں کہ 'یہ شرط نادر نے فوری طور پر مان لی کیونکہ اب وہ مہم جوئی میں وقفہ چاہتا تھا۔ اس کے سپاہی پانی اور خوراک کی وجہ سے نڈھال ہو رہے تھے'۔

جب میاں نور محمد، نادر شاہ کے سامنے پیش ہوا تو دونوں میں جو گفتگو ہوئی وہ مختلف مسودوں میں مختلف طریقوں سے تحریر کی گئی ہے۔ اگر تحریر کرنے والا میاں نور محمد کا نمک کھانے والا ہے تو گفتگو کا پلڑا یقیناً میاں کی طرف جھکے گا، اگر نادر کا نمک خوار ہے تو پلڑا اس کی طرف جھکے گا۔ بہر حال اس گفتگو کا لبِ لباب کچھ اس طرح بنتا ہے:

'بھاگے کیوں تھے؟' نادر کا سوال

میاں کا جواب: 'ہم آباؤ اجداد سے ہندوستان کے حاکموں کو خراج دیتے آئے ہیں، اس کیفیت میں اگر میں آپ سے ہاتھ ملا لیتا تو آپ کو یقیناً مجھ پر اعتماد نہ رہتا'۔

اگر تھوڑا غور سے دیکھا جائے تو حاکم اور محکوم کی گفتگو کیا ہوگی؟ جس حاکم کو سندھ کے

حاکم خراج دیتے تھے، اس نے سب کچھ نادر شاہ کی جھولی میں ڈال دیا تھا اور دہلی کے بازاروں میں جو دونوں اطراف سے خون بہا تھا ان کو بھی کوئی برس تو نہیں بیتے تھے۔ وہ خبریں بھی میاں تک پہنچی ہوں گی۔ ایران، افغانستان، لاہور، ملتان اور دہلی تک نادر کا پھریرا جھولتا تھا۔ تو بچارے میر صاحبان کے پاس بچا کیا تھا جو کچھ کرتے۔ بس وقت کی بچھی شطرنج کی بساط تھی اور دوسرے حاکموں کی طرح یہ بھی آنکھیں جھکائے بیٹھے تھے۔ نادر شاہ افشار دونوں طرف سے مہرے کھیلنے کی حالت میں تھا۔ یہ فقط بند زبان اور خاموش آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔ سوال کرنے کے لیے جو زبان چاہیے ہوتی ہے وہ نادر کے خوف نے ان سب سے چھین لی تھی۔ جب اس گفتگو کے بعد خدا یار خان نے مجبور ہو کر پوشیدہ خزانے نادر کو پیش کیے تو ان میں بہت سی قیمتی اشیاء ایسی تھیں جن کا تعلق صفوی خاندان سے تھا۔ خدا یار خان نے بتایا کہ جب غلزئی افغانوں کو نادر کے ہاتھوں شکست ہوئی تو انہوں نے لوٹا ہوا ایرانی شاہی خزانہ مختلف علاقوں میں بھجوا دیا۔ سندھ کی طرف بھیجا جانے والا کچھ سامان مفرور غلزیوں سے خرید لیا۔ کلہوڑا خاندان کا خزانہ جو میاں نور محمد نے نادر کو دیا اس کی مالیت ایک کروڑ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ ساتھ میں سالانہ 20 لاکھ خراج مقرر کیا گیا اور میاں کے بیٹوں میں سے کسی ایک بیٹے کی قیادت میں 2 ہزار گھڑ سواروں کی جمعیت فراہم کرنا طے پائی۔ میر نور محمد خان کو 'شاہ قلی خان' کا لقب تو ضرور ملا، مگر اس کی طاقت کو توڑنے کے لیے سندھ کے 3 حصے کر دیے گئے:

سبی اور کاچھو: محبت خان بروہی جو خان آف قلات کو ملا۔

شکار پور: صادق محمد خان داؤد پوتہ کو ملا۔

باقی سندھ کا بادشاہ میاں ہی تھا۔ اس کارروائی کے بعد نادر شاہ لاڑکانہ پہنچا۔ مرزا مہدی تحریر کرتے ہیں کہ 'نادر لاڑکانہ ہی میں تھے، تب اسے دہلی سے شہنشاہ کی طرف سے ایک سفارت ملی، سفارت میں ایک خط اور قیمتی تحائف موصول ہوئے۔ نادر نے جواب میں شہنشاہ کو کچھ عمدہ نسل کے گھوڑے اور 2 سو اونٹوں پر بلخ کے لذیذ خربوزے روانہ کیے'۔

مرزا مہدی جو 'تاریخ نادری' کا مصنف ہے اس کو یہ اندر سے کچھ اچھا نہیں لگا یا عجیب لگا۔ اس لیے پہلے تو اس نے نادر شاہ کو جو خربوزوں سے رُغبت تھی اس کے بارے میں کئی جملے لکھے اور آخر میں لکھا کہ 'ہندوستان سے ملنے والے بیش قیمت خزانوں اور تخت طاؤس کے جواب میں نادر شاہ کا یہ حقیر تحفہ واقعی مغل بادشاہ کے شایان شان تھا'۔

میاں نور محمد کلہوڑو کا تعارف اس تحریر میں یقیناً نامکمل ہے۔ کیونکہ وہ ایک بادشاہ اور مصنف کے ساتھ سندھ کے آب پاشی نظام کو بہتر بنانے والا اور 500 کے قریب نہریں کھدوانے والا امیر بھی تھا۔ اس کے کتب خانے سے بہت ساری نایاب کتابیں بھی نادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جس کا دکھ میاں صاحب کو تھا اور اس سے بڑا دکھ یہ بھی تھا کہ اس کے 3 بیٹے محمد مراد یاب خان، غلام شاہ اور عطر خان 1747ء تک نادر شاہ کے پاس ایران میں تھے۔ یہ وہ سال ہے جب جون کے گرم شب و روز میں کوچان ایران میں، نادر شاہ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ 19 جون کی شام خابوشان سے دو فرسخ (ایک فرسخ تین میل) کے فاصلہ پر فتح آباد کے اونچے مقام پر نادر نے پڑاؤ ڈالا۔ نادر کو اپنی موت کا شاید پکا یقین ہو گیا تھا اس لیے مشہد سے اس طرف نکلنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹوں اور پوتے کو تحفظ کی خاطر قلات روانہ کر دیا تھا۔ اسی رات محمد قلی خان اور صالح خان کے حملے میں نادر بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ نادر کے اپنے بھتیجے نے اس سے بغاوت کر دی تھی۔ مسلسل تھکان اور ذہنی مشقت کے ساتھ جسمانی ضعف نے اسے بیمار کر دیا تھا۔ اس کی حوس وقت کے ساتھ بڑھتی گئی۔ دولت سمیٹنے کی حوس میں اس نے ظلم اور بربریت کی انتہا کر دی۔ آخری وقت میں وہ تقریباً اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اسے ہر فرد سے لگتا تھا کہ وہ اسے قتل کر دے گا اور اسے ایسا لگنا بھی چاہیے تھا کیونکہ ہزاروں بے گناہ انسانوں کا بہایا ہوا خون ذہن سے سکون چھین لیتا ہے۔ تلوار سے کٹتے گلے، بجھتی آنکھیں اور ٹھنڈا پڑتا جسم یہ سارے ایسے مناظر ہیں جو آپ کے دل و دماغ سے سکون اور خوشی کے گلابوں کی فصل کو تیزی سے بے رنگ اور خشک کر دیتے ہیں۔ پھر ان گلابوں کی کانٹے دار جھاڑیاں رہ جاتی ہیں جو آپ کو سکون سے جینے نہیں دیتیں۔ نادر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

حوالہ جات

- 'نادر شاہ'۔ ایل لاک ھارٹ۔ ترجمہ: طاہر منصور فاروقی۔ تخلیقات لاہور
- 'بیان واقع'۔ منشی عبدالکریم کشمیری۔ تصحیح: ڈاکٹر کے۔ بی نسیم۔ دانشگاہ پنجاب، لاہور
- 'انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم'، جلد اول۔ ولیم ایل لینگر۔ ترجمہ: مولانا غلام رسول مہر۔ الوقار پبلیکیشنز، لاہور
- 'منشور الوصیت ائیں دستور الحکومت'۔ میاں نور محمد خدا یار خان۔ سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد
- 'تاریخ سندھ: کلہوڑا دور، جلد اول۔ غلام الرسول مہر، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد
- 'تاریخ کے مسافر'۔ ابوبکر شیخ۔ سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور
- 'مرقع دہلی'۔ درگاہ قلی خان۔ مترجم: خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
- 'تاریخ افغانستان'۔ محمد اسماعیل ریحان۔ جلد اول۔ المنہل پبلشرز، کراچی۔

عرب اسرائیل تعلقات کی خفیہ اور طویل داستان

تحریر: جوزف مسعد

پچھلے کچھ عرصے کے دوران اسرائیلی حکام بشمول خلیجی ریاستوں، مراکش اور سوڈان کے دیگر عرب ممالک کے ساتھ قریبی تعلقات کی استواری کے لیے کوششیں کرتے نظر آئے ہیں۔ یہ وہ ریاستیں ہیں کہ انہیں بھی اب یہ محسوس ہوا ہے کہ ایران کے برعکس، اسرائیل ان کا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے۔ اس سے سیاسی حلقوں میں کافی ہلچل دکھائی دی ہے کیونکہ ان ملکوں نے بظاہر اسرائیل کے ساتھ اب تک اس لیے تعلقات ترک کیے رکھے تھے کہ وہ فلسطینیوں کے حقوق کی حمایت کرتے ہیں۔

لیکن یہ سب افسانوی حقیقتیں ہیں، کیونکہ ماضی میں عرب ریاستوں کے اکثر رہنماؤں کے اسرائیل اور اس سے قبل صہیونی تحریک کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رہے ہیں۔ مزاحمت کا یہ بیانیہ عرب حکام اور اسرائیل دونوں کی جانب سے پیش کیا جاتا رہا، جس میں یہ بھی کہا گیا کہ عربوں نے اپنے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے فلسطینیوں کی خاطر اسرائیل سے جنگیں لڑی ہیں۔ اب باہمی معاونت کے نئے موقف کے بعد یہ کہا جا رہا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ عرب حکام اپنے مفادات کو مقدم رکھیں، گویا اس سے قبل تو فلسطین کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ تقریباً انہی خیالات کا اظہار سوڈان کے آرمی چیف نے حال ہی میں یوگنڈا میں اسرائیلی وزیراعظم سے ملاقات کے بعد کیا تھا۔ حالانکہ کسی سوڈانی سرکاری شخصیت کی نتنیاہو سے یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔ سال 1950ء کے دوران جب سوڈان برطانوی اور مصری حکومتوں کے ماتحت تھا اور آزادی حاصل نہیں کی تھی تو اس وقت ملک کی بڑی جماعت حزب الامت نے خفیہ طور پہ اسرائیل سے اپنی آزادی کی حمایت کے لیے تعاون مانگا تھا، جب آزاد سوڈان کا قیام عمل میں آ گیا تو 1957ء میں پہلے سوڈانی وزیراعظم عبداللہ خلیل نے پیرس میں اسرائیلی رہنما گولڈا میئر سے خفیہ ملاقات کی تھی۔ 80 کی دہائی کے اوائل میں صدر جعفر نمیری نے اسرائیلی حکام کے ساتھ مل کر اتھوپیا کے یہودیوں کی اسرائیل نقل مکانی کو یقینی بنایا تھا تاکہ وہ فلسطینی زمینوں پر جا کے رہائش اختیار کریں۔ اسی طرح 2016ء میں جب عمر البشیر حکومت میں تھے، سوڈانی وزیر خارجہ نے اپنے ملک سے امریکی اقتصادی پابندیاں اٹھانے کے عوض اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات ک۔ قیام کی پیشکش کی تھی، جب ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ 'سوڈان کی سکیورٹی اور اس کے مفادات مقدم ہیں'۔ باہمی تعلقات کی یہ تاریخ اسرائیل کے قیام کے بعد کی نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے کی ہے۔ امیر فیصل الحسین جو کچھ وقت کے لیے حجاز کے اور بعد ازاں عراق کے بادشاہ رہے، انہوں نے پیرس امن کانفرنس ہونے سے دو ہفتے قبل 3 جنوری 1919ء کو اس وقت عالمی صہیونی تنظیم کے رہنما کھائم ویزمان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا کہ اگر اسے ایک وسیع سلطنت کے قیام میں تعاون کیا جائے تو وہ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام میں مدد کریں گے۔ مگر 1920ء میں فرنچ استعمار نے امیر فیصل بن الحسین کو حکومت سے الگ کر دیا۔ اس کے بعد ان کے بھائی امیر عبداللہ بھی صہیونی تحریک کو ساری زندگی یہ کہتے رہے کہ اگر انہیں فلسطین اور مشرقی اردن میں بادشاہ بنایا جائے تو وہ ان کے مقاصد کے حصول میں راہ ہموار کریں گے۔ امیر عبداللہ کو انہی تعلقات پر ناراضی کی وجہ سے 1951ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اردن کے بادشاہ حسین نے 1960ء میں اپنے ملک کے فوجی رہنماؤں کو اسرائیلی حکام کے ساتھ تعاون کی اجازت دی تھی۔ اس کے بعد 1963ء میں لندن میں اپنے ذاتی معالج کے کلینک میں اسرائیلی رہنماؤں سے ملے تھے۔ بعد ازاں تواتر کے ساتھ وہ خفیہ طور پہ اسرائیل جاتے رہے۔ اسحاق رابن جس نے 1948ء میں خود فلسطینیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے کا آغاز کیا تھا، 1994ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو اردن کے شاہ حسین اپنے دوست کے جنازے میں شرکت کے لیے اسرائیل آئے تھے۔ شاہ حسین اسرائیل کے ساتھ اپنے تعلقات کے جواز کے لیے ایک تو اپنی حکومت کے تحفظ کو دلیل بناتے تھے اور دوسرا مصری صدر جمال عبدالناصر کے پریشر اور فلسطینی حریت پسند تحریکوں کے خطرات کو بھی وجہ بتاتے تھے۔ ایسے ہی لبنان کے مارونی چرچ کے 1940ء کی دہائی سے صہیونی رہنماؤں کے ساتھ قریبی تعلقات قائم ہیں۔ لبنان کے مسیحی وہاں اپنے لیے اسرائیلی طرز کی فرقہ پرست ریاست کے قیام کی خواہش رکھتے ہیں۔

1950ء میں تیونس کی حزب دستور نے فرنچ استعمار سے آزادی کے لیے اسرائیلی نمائندگان کے تعاون کے ساتھ اقوام متحدہ میں قرارداد پیش کی تھی۔ آزادی کے بعد تیونس کے حکمران حبیب بورقیبہ نے 1987ء میں اپنی وفات کے وقت تک اسرائیل کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے تھے۔ 60 کی دہائی میں اسرائیل نے یمن میں بادشاہت اور جمہوریت پسندوں کے مابین تنازع کے دوران بادشاہت کو قائم رکھنے

کے سعودی موقف کی حمایت کی تھی اور یمن میں بادشاہت کے تعاون کے لیے اسرائیلی جہاز اسلحہ اور بھاری رقم لے کر اترے تھے۔ اُسی دہائی سے مراکش کے اسرائیل کے ساتھ دوستانہ روابط چلے آرہے ہیں۔ مراکش کے شاہی خاندان نے خفیہ معاہدوں کے تحت اپنے ملک کے یہودیوں کو اسرائیل منتقل کیا تاکہ وہ فلسطینی اراضی پر اپنے گھر تعمیر کرسکیں۔ 1963ء میں مراکشی وزیر محمد اوفقیر نے اسرائیلی حکام کے ساتھ اپنی خفیہ ایجنسیوں کی تربیت کا معاہدہ کیا تھا اور اپنی حکومت کے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کا تعاون بھی طلب کیا تھا۔ 1976ء میں اسحاق رابن کو مراکش کے خفیہ دورے پر مدعو کیا گیا تھا۔ 1986ء کے بعد سے دونوں ملکوں میں کچھ خفیہ نہیں ہے، کیونکہ اسی سال شمعون پیریز کا کھلے عام فقید المثال استقبال کیا گیا تھا۔ جبکہ اسرائیل نے 2018ء میں صدر ٹرمپ کی جانب سے پیش کی گئی 'صدی کی ڈیل' کو تسلیم کرنے اور اسرائیل میں اپنا سفارت خانہ کھولنے کے عوض یہ پیشکش کی کہ وہ اس بات کی ضمانت دے گا کہ امریکا مراکش کی حدود کے ساتھ واقع غربی صحرا پر اس کی ملکیت کو تسلیم کرلے گا۔ مصر اور اسرائیل کے روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہیں۔ 1991ء کے بعد سے اسرائیلی سرکاری نمائندگان اور کھلاڑیوں کا خلیجی ریاستوں میں کھلا آنا جانا ہے۔ بالخصوص قطر، بحرین، متحدہ عرب امارات اور عمان۔ جبکہ سعودی عرب سے تعلقات پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ عرب حکومتوں کے اسرائیل کے ساتھ تعلقات عداوت کے رہے ہوں یا دوستی کے، اس کی بنیاد ان حکام کے ذاتی مفادات تھے، جنہیں 'قومی مفادات' کے نام سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ ان دوطرفہ تعلقات کے نتیجے 1991ء میں 'اوسلو معاہدہ' اور 'میڈرڈ امن کانفرنس' ہوئے جس کے بعد فلسطینی قومی قیادت اور فلسطین لبریشن آرگنائیشن اسرائیلی فوج کے ماتحت ہوکر رہ گئے ہیں۔ یہ ساری پیش رفت اس بات کی دلیل ہے کہ اسرائیل نے مسلسل عرب اشرافیہ اور ان ملکوں کے تاجر طبقے کو اپنے حق میں مائل کرنے کی سعی جاری رکھی ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ اشرافیہ کس قدر ان کوششوں کے جواب میں تعاون کے لیے تیار رہی ہے۔

اسرائیل نے اگرچہ کامیابی کے ساتھ ان ممالک کی سیاسی اور تاجر اشرافیہ کو اپنی طرف راغب کیا ہے، تاہم وہ عرب ملکوں کے عام دانشور حلقے کو اپنے حق میں نرم کرنے میں ناکام ہوا ہے، سوائے ان گنے چنے افراد کے جو عرب حکام کے اشاروں پر کام کرتے رہے۔ اسی طرح عرب عوام نے بھی اسرائیل کو سختی سے مسترد کیے رکھا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسرائیل ان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

فیض احمد فیض

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ہٹلر کی دیوانی ساوِتری دیوی

یونان کی گولڈن ڈان پارٹی کی ویب سائٹ پر نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک ہندو خاتون کی تصویر ہونا حیران کن بات ہے، تصویر میں خاتون جرمنی کے آمر ایڈولف ہٹلر کے مجسمے کو دیکھتی نظر آ رہی ہیں۔ گولڈن ڈان یونان کی ایک نسل پرست پارٹی ہے جو یونان سے غیر ملکیوں کو بے دخل کر رہی ہے لیکن ایک ہندو عورت کی تصویر اس پارٹی کی ویب سائٹ پر کیوں ہے اور ہٹلر کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ یہ سوال میرے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ دماغ پر تھوڑا زور ڈالا تو اس عورت کا نام آسانی سے یاد آیا یہ ساوتری دیوی ہے۔ ساوتری دیوی نے اپنی کتاب (دی لائٹننگ اینڈ دی سن) میں جرمنی کے آمر ایڈولف ہٹلر کو وشنو کا اوتار قرار دیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ قوم پرست سوشلزم دوبارہ ابھرے گا۔ امریکہ اور یورپ میں دائیں بازو کی قوتیں آہستہ آہستہ زور پکڑ رہی ہیں، اس کے ساتھ ہی ساوتری دیوی کا نام بھی موضوعِ بحث ہے۔ امریکہ کے بائیں بازو کے رہنما رچرڈ سپینسر اور سٹیو بینن ساوتری دیوی کے کام کو دوبارہ منظرِ عام پر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر ساوتری دیوی کے نام اور لباس کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ مکمل طور پر یورپی عورت تھیں۔ وہ سنہ 1905 میں فرانس کے لیون شہر میں پیدا ہوئی تھیں۔ ساوتری دیوی کی ماں برطانوی تھیں جبکہ والد یونانی-اطالوی تھے۔ ابتدا میں ساوتری دیوی نے سماج وادی خیالات کو مسترد کیا اور سنہ 1978 میں ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا: ایک بدصورت لڑکی کبھی خوبصورت لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتی۔

وہ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد سنہ 1923 میں ایتھنز پہنچ گئیں۔ انھوں نے مغربی اتحاد پر یونان کی توہین کرنے کا الزام عائد کیا۔ ساوتری دیوی کا خیال تھا کہ یونان اور جرمنی مظلوم ممالک تھے۔ یہودیوں کے خلاف ہٹلر کی ظالمانہ کارروائیاں ساوتری دیوی کے نزدیک (آرین نسل) کو بچانے کا قدم تھا۔ انھوں نے ہٹلر کو اپنا رہنما یا گائیڈ بنا لیا تھا۔ 1930 کے آغاز میں ساوتری دیوی یورپ کی بت پرست تاریخ کی تلاش میں ہندوستان آئیں۔ ان کا خیال تھا کہ انڈیا میں ذات پات کے نظام کی وجہ سے دوسری ذاتوں میں شادیاں نہیں ہوتیں اور یہاں انھیں خالص (آریہ نسل) کے لوگ ملیں گے۔ ساوتری نے ہندوستانی زبانیں سیکھیں اور یہاں ایک برہمن شخص سے شادی بھی کی جسے وہ اپنی ہی طرح (آرین) کہتی تھیں۔ ساوتری دیوی کا کہنا تھا کہ ہٹلر زمانے کی رفتار کے برعکس چلنے والا انسان ہے۔ جو ایک دن دنیا سے برائیاں ختم کر دے گا اور (آریوں کی حکمرانی کا سنہرا) دور شروع ہوگا۔

اسی دوران ساوتری نے کولکتہ میں ہندو قوم پرستی کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ جب انگریزوں نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو بگاڑنے کی کوشش کی تو اس سے ہندوتوا کی تحریک کو بھی جلا ملی۔ اس تحریک میں یہ کہا گیا کہ ہندو ہی آریوں کے حقیقی وارث ہیں اور ہندوستان ایک ہندو ملک ہے۔ ساوتری نے اس تحریک کے بانی سوامی ستیانند کے ساتھ کام کیا۔ سوامی ستیانند نے ساوتری دیوی کو یہ اجازت دی کہ وہ ہندو تحریک کے ساتھ فاشزم کی باتیں شامل کر سکتی ہیں۔ ساوتری نے ملک کے بہت سے حصوں کا دورہ کیا۔ وہ لوگوں سے بنگالی اور ہندی زبان میں باتیں کرتی اور آریوں کی اہمیت ان پر واضح کرتی تھیں۔ 1945 میں جرمنی میں نازیوں کے خاتمے کے بعد ساوتری دیوی یورپ پہنچیں اور 1948 میں وہ جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

وہاں انھوں نے نازی جرمنی کے کئی پرچے تقسیم کیے اور نعرے لگائے کہ (ایک دن ہم دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور جیت جائیں گے۔)

ساوتری کی شادی اور اپنے شوہر کے ساتھ ان کے تعلقات کو شبے کی نظر سے دیکھا گیا۔ بہت سے لوگ اِست مکھرجی کے ساتھ ان کی شادی کی بات کو نہیں مانتے۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں کی ذات مختلف تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ساوتری انڈیا واپس آ گئی تھیں۔ وہ ہندوستان کو ہی اپنا گھر سمجھتی تھیں وہ دہلی میں ایک فلیٹ میں رہنے لگیں، پاس پڑوس کی بلیوں کو کھانا کھلاتی تھیں اور اکثر شادی شدہ ہندو عورتوں کی طرح سونے کے زیورات پہنا کرتی تھیں۔ 1982 میں انگلینڈ میں اپنے ایک دوست کے گھر وہ انتقال کر گئیں۔ آج انڈیا میں وزیر اعظم نریندر مودی کی قیادت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ہے۔ اس پارٹی کے بنیادی نظریے کو بھی ہندوتوا کے اصولوں پر مبنی کہا جاتا ہے۔ آج شاید ہی کوئی ایسا ملے جو ساوتری دیوی کو جانتا ہو لیکن انڈیا میں ہندو قوم پرست نظریے کو پھیلانے میں انھوں نے بہت اہم کردار نبھایا تھا۔

نوٹ: یہ تحریر پہلی بار بی بی سی اردو پر 30 اکتوبر 2017 کو شائع کی گئی تھی۔

کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ 1884 اور 1915 کے درمیان نمیبیا افریقہ کے ایک ایسے خطے کا حصہ بھی تھا جسے 'جرمن جنوب مغربی افریقہ' کہا جاتا تھا۔ جرمن سلطنت نے 1904-08 کے دوران ناما، ہیریرو اور سان کے مقامی افراد کی جانب سے کی گئی بغاوت کے دوران ہزاروں افراد کو قتل کیا۔ کئی مورخین اسے 'بھولی ہوئی نسل کشی' کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس سال کے شروع میں نمیبیا نے جرمنی کی جانب سے 10 ملین یورو معاوضے کی پیشکش کو ٹھکراتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس رقم پر نظر ثانی کے لیے بات چیت جاری رکھیں گے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد نمیبیا جنوبی افریقہ کے کنٹرول میں آ گیا تھا اور 1990 میں اس نے آزادی حاصل کر لی تاہم یہاں ابھی بھی بہت سے شہر ایسے ہیں جن کے نام جرمن میں ہیں۔ اس کے علاوہ جرمن زبان بولنے والوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت بھی موجود ہے۔

نمیبیا کی تحریک آزادی سے بائیں بازو کی پارٹی سواپو نے جنم لیا اور 1990 سے وہ ملک پر حکمرانی کر رہی ہے لیکن ماہی گیری کی صنعت میں رشوت کے الزامات کے بعد اس پارٹی کی حمایت میں کمی آئی ہے۔ گذشتہ ماہ کے انتخابات میں سوپو کو 30 بڑے شہروں اور دیہاتوں میں ناکامی کے بعد وہاں کا کنٹرول کھونا پڑا ہے۔

نمیبیا کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے امیدوار ایڈ ولف ہٹلر

دوسری عالمی جنگ میں جرمنی پر حکومت کرنے والے ایڈ ولف ہٹلر کے ہم نام نمیبیا کے ایک سیاست دان نے بلدیاتی انتخابات میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کر لی ہے تاہم ان کے دنیا فتح کرنے کے کوئی ارادے نہیں۔

ایڈ ولف ہٹلر یونونا گذشتہ ہفتے اومپنڈا حلقے میں کونسلر منتخب ہوئے تھے۔

جرمن اخبار بلڈ کو انٹرویو دیتے ہوئے انھوں نے زور دیا کہ ان کا نازی نظریے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ کسی زمانے میں جرمنی کی کالونی رہنے والے اس ملک میں دوسرے جرمن ناموں کی طرح 'ایڈ ولف' کوئی غیر معمولی نام نہیں ہے۔

ایڈ ولف ہٹلر یونونا حکمران جماعت سواپو پارٹی کے امیدوار ہیں جس نے نوآبادیاتی نظام اور سفید فام اقلیتوں کی حکمرانی کے خلاف مہم چلائی ہے۔ یونونا نے اعتراف کیا کہ ان کے والد نے ان کا نام نازی رہنما کے نام پر رکھا تھا، لیکن ان کا کہنا تھا کہ 'شاید وہ ہٹلر اور ان کے نظریات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے تھے۔' تقریباً 85 فیصد ووٹوں سے کامیابی حاصل کرنے والے یونونا بتاتے ہیں کہ 'بچپن میں، میں نے اسے بالکل عام نام کے طور پر دیکھا لیکن بڑے ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ یہ آدمی تو پوری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا اور میں ایسی کوئی خواہشات نہیں رکھتا۔' یونونا کہتے ہیں کہ ان کی اہلیہ انھیں ایڈ ولف بلاتی ہیں اور تمام لوگ انھیں اسی نام سے جانتے ہیں لہذا وہ اسے تبدیل کرنے

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرمالیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہو اسی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرمالیں آن لائن ویب سائٹ اور رسالے میں شائع شدہ مواد کاپی رائٹ ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کاپی رائٹس قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

سماجی سرگرمیاں

رپورٹ عابد شمعون چاند سعودی عرب

ریاض (عابد شمعون چاند نمائندہ لاہور انٹرنیشنل) سعودی عرب میں انصاف ڈاکٹر فورم کے وفد کی ڈاکٹر ضمیر کی قیادت میں سفارتخانہ پاکستان میں سفیر پاکستان راجا علی اعجاز سے ملاقات ملاقات کا مقصد کرونا وائرس کی دوسری لہر کے حوالے پاکستانی کمیونٹی کو درپیش مسائل کے ساتھ ساتھ کرونا وائرس کے حوالے سے کاروباری نظام اور تنخواہوں میں کٹوتی کے باعث پاکستانی کمیونٹی کو درپیش مسائل پر گفتگو کی گئی اور جیلوں میں پاکستانی کمیونٹی کے ایسے لوگ جو چند جرمانوں کی وجہ سے پاکستان نہیں جاسکتے اور ہروب اور مطلوب جیسے کیسوں پر بات چیت کی زیر بحث آئیں سفیر پاکستان راجہ علی اعجاز نے تمام مسائل کے حوالے سے بتاتے ہوئے کہا کہ ہم پہلے ہی ان پر بہت کام کر رہے ہیں اور ہماری ہر طرح کی 24 گھنٹے مدد کے لیے حاضر ہیں اور جہاں جہاں بھی سفارتخانہ پاکستان کی ضرورت ہوگی سفارتخانہ اپنی کمیونٹی کے شانہ بشانہ کھڑا ہوگا۔

صدر ریاض ریجن ظفر خان نے کہا کہ انصاف ڈاکٹر فورم پچھلے دو سال سے پاکستانی کمیونٹی کی ہر لحاظ سے نہ صرف میڈیکلی بلکہ مالی مدد بھی کی جاتی ہے۔

اس موقعہ پر ڈاکٹر حنیف، ڈاکٹر فہد، اور کوارڈینیٹر وسیم خان نے بھی انصاف ڈاکٹر فورم کے حوالے سے بتایا کہ انصاف ڈاکٹر فورم پاکستانی کمیونٹی کی دن رات خدمت میں پیش پیش ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

ریاض (عابد شمعون چاند) سعودی عرب میں مجلس پاکستان کی جانب سے افریقہ میں لاکھوں لوگوں کو مسلمان کرنے والی عظیم شخصیت اسلامک فاونڈیشن کینیا کے چیئرمین راو اختر کے اعزاز میں پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں پاکستانی کمیونٹی کی سیاسی، سماجی، ادبی، فلاحی اور صحافتی تنظیموں کے اکابرین نے بھرپور شرکت کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے راو اختر کا کہنا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے سعودی عرب سے افریقہ کی طرف ہجرت کروائی جہاں مسلمانوں کو زبردستی دوسرے مذہب کی طرف راغب کیا جا رہا تھا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہم نے نہ صرف اس اقدام کو روکا بلکہ لاکھوں لوگوں کو مسلمان کیا اور وہاں مسجدیں، قرآن مجید کے مکاتب اور تعلیمی ادارے قائم کیے تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مجلس پاکستان کے صدر رانا عبدالراوف نے کہا کہ اج ہماری خوش قسمتی ہے کہ راو اختر جن کی دین اسلام کے لیے لازوال قربانیاں ہیں آج ہمارے ساتھ ہیں مجلس پاکستان کے جنرل سیکرٹری حافظ عبدالوحید نے راو اختر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی کاوشوں کو سراہا خوبصورت اور ایمان افروز تقریب منعقد کرنے پر حاضرین نے مجلس پاکستان کے عہدیداروں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

ریاض (عابد شمعون چاند) دارلحکومت ریاض میں ڈھائی ماہ جاری رہنے والے فالکن فٹبال کلب کی جانب سے چوتھی فالکن سپر فٹبال لیگ کا شاندار فائنل میچ کھیلا گیا فائنل میچ کو دیکھنے کے لیے فٹبال کے مداحوں نے بھرپور شرکت کی فائنل میچ رویال فوکس لاین اور شباب ایف سی کی ٹیموں کے درمیان کھیلا گیا میچ چار چار گول سے برابر رہا اور میچ کا فیصلہ پیلنٹی کک پر کیا گیا جو رویال فوکس لائن نے جیت کر فائنل اپنے نام کیا فائنل میچ کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فالکن فٹبال کلب کے چیئرمین حنیف بابر نے کہا کہ فالکن فٹبال کلب نہ صرف نوجوان کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ انہیں آگے بڑھنے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے ہماری کوشش ہے کہ فٹبال جیسے کھیل کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہو اور اس سلسلے میں فالکن فٹبال کلب اپنا کلیدی کردار ادا کر رہا ہے حنیف بابر نے کھیلوں کی سرگرمیوں کی اجازت دینے پر سعودی فرمانروا شاہ سلمان بن عبدالعزیز اور ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کو خراج تحسین پیش کیا فالکن فٹبال کلب کے چیف آرگنائزر فرحان مشتاق نے کہا کہ اس طرح کے ٹورنامنٹ کا مقصد ایشین نوجوان نسل کو فٹبال جیسے عالمی کھیل کی طرف راغب کرنا ہے فرحان مشتاق نے مزید کہا کہ

فالکن فٹبال کلب کے زیر اہتمام ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد ہوتا رہے گا تا کہ نوجوانوں کو اپنی صلاحیتوں کو دیکھانے کے مواقع میسر آسکیں یاد رہے اس ٹورنامنٹ میں 8 ایشین اور 6 عرب ٹیمیں شامل تھیں شائقین فٹبال نے طویل مدت کے بعد ایسی سرگرمیاں دیکھنے کا مواقع فراہم کرنے پر فالکن فٹبال کلب کے عہدیدارن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خراج تحسین پیش کیا تقریب کے آخر میں فالکن فٹبال کلب کے چیئرمین حنیف بابر نے جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی اور اعلیٰ کارکردگی دکھانے والے کھلاڑیوں میں شیلڈز، کیش اور دیگر انعامات بھی تقسیم کیے۔

ریاض (عابد شمعون چاند) نائب صدر پاکستان مسلم لیگ ن ریاض ریجن نور خان شنواری کی رہائش گاہ (شنواری ھاؤس) پر مرکزی صدر پاکستان مسلم لیگ ن سعودی عرب ملک منظور حسین اعوان کی خصوصی ہدایت پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا جس میں کورکمانڈرز کمیٹی اور کارکنان کی بھرپور شرکت۔ اجلاس میں 25 دسمبر قائداعظم محمد علی جناح اور قائد محترم میاں محمد نواز شریف کے جنم دن اور ورکر کنونشن کو کامیاب بنانے اور انتظامات کے حوالے سے تفصیلی جائزہ، مشاورت اور تجاویز ذمہ داریاں اور پروگرام کو حتمی شکل دے دی گئی۔ صوبائی صدر پاکستان مسلم لیگ ن ریاض ریجن میاں محمد طارق جنید نے کارکنان کی تجاویز کو سراہتے ہوئے کہا کہ کارکنان کا یہی جوش، جزبہ ولولہ اور جنون ہی (نون) کی ضرورت ہے اللہ مزید استقامت دے اور ثابت قدم رکھے آمین۔۔ نائب صدر انجینئر مرزا جاوید کی والدہ ماجدہ کی جلد صحت یابی کیلئے دعا کرائی گئی نائب صدر و سیکرٹری جنرل انجینئر راشد منہاس کے علاوہ چوہدری عبدالقیوم کانگ، ملک محمد اسحاق، محمد ارشد بٹ (نائب صدر یوتھ ونگ) چوہدری اختر حسین گوندل، چوہدری نواز، محمد نواب خان اور دیگر کارکنان نے نور خان شنواری کی مہمان نوازی اور پرتکلف عشائیہ دینے پر طرفین کی جانب سے شکریہ ادا کیا گیا۔

نابینا خاتون نجومی باباوانگا کی 2021 کیلئے پریشان کن پیشگوئیاں

بلغاریہ کی مشہور خاتون آنجہانی نجومی باباوانگا کا نام دنیا بھر میں مقبول ہے جنہوں نے بہت سے تباہ کن واقعات کی پیش گوئی کی اور ان کی کئی پیش گوئیاں پوری ہوئی ہیں جبکہ انہوں نے اگلے سال کے لیے کئی اہم پیشگوئیاں کی ہیں۔

لندن: باباوانگا نے کہا ہے کہ سال 2021ء میں وہ دیکھ رہی ہیں کہ دنیا میں مصائب اور حادثات بڑھیں گے، دنیا کو دکھوں کا سامنا ہوگا جو انسانی راہ کو تبدیل کردے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ایک طاقتور اژدہا پوری انسانیت کو لپیٹ میں لے گا اور تین عفریت (جائنٹس) مل کر ایک ہوجائیں گے۔ بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق یہاں ڈریگن کا مطلب چینی معیشت اور اس کا پھیلاؤ بھی ہوسکتا ہے۔

انہوں نے کہا تھا کہ لوگ اپنے عقائد اور مذاہب کی بنیاد پر مزید سخت تقسیم سے گزریں گے اور روسی صدر پیوٹن کو قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تاہم انہوں نے یہ عجیب وغریب پیشگوئی بھی کی ہے کہ سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ایک غیر معمولی دماغی ونفسیاتی عارضے کا شکار ہوں گے۔ بلغاریہ کی زبان میں ''بابا'' دادی یا نانی کو کہا جاتا ہے اور یہ خاتون ایک حادثے میں نابینا ہوگئی تھیں۔ باباوینگا جنوری 1911ء میں بلغاریہ میں پیدا ہوئی تھیں اور وہ ایک مشہور مذہبی پیشوا، جڑی بوٹیوں کی حکیم تھیں۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ غیر معمولی اور پراسرار صلاحیتوں کی مالک ہیں اور ان کے علاج سے بیمار ٹھیک ہوجاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے روسی زوال، چرنوبل ایٹمی حادثے، 2004 میں انڈونیشیائی سونامی، 11 ستمبر کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور حملوں کی پیش گوئی کی تھی تاہم ان کی بعض پیش گوئیاں غلط بھی ثابت ہوئی ہیں۔ باباوانگا کا انتقال 11 اگست 1996 کو ہوا تھا جبکہ انہیں بلقان کی نوسٹراڈیمس بھی کہا جاتا ہے۔

باباوینگا کے مطابق دنیا کا خاتمہ 51 صدی عیسوی میں ہوجائے گا جبکہ سال 2021 کے لیے انہوں نے کہا تھا کہ وہ 5 پھر 100 اور اس کے بعد بہت سارے صفر والے اعداد دیکھ رہی ہیں۔ اسی سال کے لیے انہوں نے ایک اچھی پیشگوئی بھی کی ہے کہ انسانیت کو لاحق دیرینہ مرض کینسر کا شافی علاج دریافت ہوجائے گا اور سورج سے توانائی کے حصول کے انقلابی راستے کھلیں گے۔

لیکن ان کی بہت سی پیشگوئیاں غلط بھی ثابت ہوئی ہیں۔ (بشکریہ بی بی سی)

نکاح کے ساتھ بھی۔ توبہ توبہ!

تحریر: یاسر پیرزادہ

مفتی منیب الرحمن صاحب نہ صرف بڑے عالم دین ہیں بلکہ عمدہ لکھاری بھی ہیں، اس بات کا ثبوت ان کے کالم ہیں جن میں شگفتگی بھی ہوتی ہے اور طنز کی کاٹ بھی، غالب جیسے 'آدھے مسلمان' کو بھی 'کوٹ' کرتے ہیں اور فیض جیسے 'کمیونسٹ' کو بھی، کالم میں حسب ضرورت شگوفے بھی بکھیرتے ہیں اور حسب توفیق پھبتیاں بھی کستے ہیں۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ آج سے چودہ سال پہلے جب میں نے 'جنگ' میں کالم لکھنا شروع کیا تو پہلا کالم ہی مفتی صاحب کی مدح میں لکھا تھا۔ اس سے آپ میری عقیدت کا حساب لگالیں۔ آج مفتی صاحب کی یاد اس لیے آئی کہ گزشتہ روز انہوں نے فدوی کی گوشمالی فرماتے ہوئے ایک کالم باندھا جس میں انہوں نے خاکسار کے مورخہ 22 نومبر کے کالم "بغیر نکاح کے۔ توبہ توبہ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ "ہمارا آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی نظر میں حلال وحرام کے پیمانے بدل چکے ہیں، کیا العیاذ باللہ کوئی نئی شریعت نازل ہوگئی ہے جو آپ تک پہنچ گئی ہے، مگر ہمیں اس کی خبر نہ ہوئی۔ اگر کسی اور کی بیٹی یا بہن اجنبی مرد کے ساتھ کسی ہوٹل میں رنگ رلیاں منائے تو ہمیں اس کا جشن منانا چاہیے۔ کیا جمہوریت اسی کا نام ہے کہ جو آپ کے نظریات کا حامی نہیں ہے، اس کا گلا گھونٹ دینا چاہیے، اس کی آواز دبا دینی چاہیے۔ نیز یہ کہاں سے لازم آیا کہ برسر عام شراب نوشی اور نامحرم لڑکے لڑکیوں کا اختلاط اور ساتھ رہنا مادی ترقی کے لیے لازم وملزوم ہیں، ورنہ اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے ترقی ناممکن ہے، ایسی کوئی دلیل ہو تو ضرور ہمیں آگاہ فرمائیے۔" اس کے علاوہ مفتی صاحب نے فدوی کو "روغن خیال" بروزن روشن خیال اور نام نہاد لبرل طبقات کے امام کا لقب بھی دیا ہے۔ مفتی صاحب بزرگ ہیں، کچھ بھی کہہ سکتے ہیں، بقول غالب، آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا۔ تاہم اچھی بات یہ ہے کہ انہوں نے دلیل مانگی ہے، تو دلیل حاضر ہے۔

فدوی کے جس کالم کا مفتی صاحب نے حوالہ دیا ہے اس میں فدوی نے متحدہ عرب امارات سے متعلق ایک خبر پہنچائی تھی کہ امارات نے اپنے قوانین میں ترمیم کر کے شراب پر پابندی غیر موثر کرنے کے علاوہ غیر مرد اور عورت کو بغیر نکاح کے اکٹھے رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس کالم میں یہ جملہ میں نے لکھا تھا کہ "ہوسکتا ہے کبھی کوئی لبرل قسم کا عالم دین کھینچ تان کر کہیں سے شراب کی گنجایش پیدا کرلے مگر نامحرم مرد اور عورت کا بغیر نکاح کے اکٹھے رہنا کہیں سے بھی اسلامی قوانین یا شریعت کے مطابق نہیں۔" اس سے آگے کیا بات رہ جاتی ہے؟ میں نے کہاں لکھا کہ حلال حرام کے پیمانے بدل گئے ہیں؟ میں نے تو صرف اطلاع دی کہ امارات میں یہ ہوگیا ہے لیکن انگریزی محاورے shooting the messenger کے مصداق مفتی صاحب نے یوں جانا کہ گویا امارات میں یہ قانونی ترمیم فدوی نے کروائی ہے۔ مفتی صاحب خود لکھتے ہیں کہ 'اگر دنیا میں کہیں مذہب اپنی اصل شکل میں نافذ نہیں ہے یا جس قدر تھا، اس کی بھی بساط لپیٹی جارہی ہے، تو ہمیں اس کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنی چاہیے'۔ بالکل درست۔ تو پھر صدائے احتجاج بلند کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ ایک احتجاجی مراسلہ امارات کے سفارت خانے کو بھجواتے جس میں ان سے پوچھتے کہ یہ کون سا اسلام آپ نافذ کرنے جارہے ہیں، کس شریعت کی رو سے آپ نے یہ مرد وزن کو بغیر نکاح کے رہنے کی اجازت دی ہے؟ آخر وہ بھی ایک اسلامی ملک ہے، مفتی صاحب جیسے جید علما وہاں بھی ہیں، عین ممکن تھا کہ وہ مفتی صاحب کی تسلی کروا دیتے اور انہیں یہ کالم لکھنے کی کھکھیڑ نہ ہوتی۔ مگر بوجوہ یہ کام شاید مفتی صاحب کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے روئے سخن فدوی کی جانب کرلیا۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے!

مفتی صاحب نے فدوی کو لبرل کا لقب نما طعنہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "وقت کا دھارا آپ کے ساتھ ہے، زمانہ آپ کا طرفدار ہے، پھر بھی آپ کو تسکین نہیں ہوتی۔" مگر آگے چل کر خود ہی یہ اطلاع بھی دی کہ "علامہ خادم حسین رضوی نے آپ (جیسے) ترقی پسند اور روشن خیال لوگوں کے ہوتے ہوئے اللہ کی اتنی مخلوق کو اپنا ہمنوا کیسے بنالیا؟" بہت احترام کے ساتھ مفتی صاحب، یہ دونوں متضاد باتیں ہیں، اسے نفسیات کی زبان میں Cognitive Dissonance کہتے ہیں، آپ کے اور میرے پسندیدہ غالب نے اس بارے میں کہا تھا "سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی، عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا"۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے ایسے کسی 'لبرل ازم' کا جھنڈا نہیں اٹھایا جس کے نزدیک محض شراب، جوا اور زنا کی اجازت ہی لبرل ازم ہے، آخری مرتبہ جب میں نے انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا میں لبرل ازم کی تعریف پڑھی تھی تو اس میں مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی تھی جسے ہمارے ہاں لبرل ازم سمجھا جاتا ہے۔

جس طبقے کا مفتی صاحب مجھے امام بنانے پر مصر ہیں اس طبقے کے ساتھ میرا کوئی لینا دینا نہیں، یہ وہ طبقہ ہے جو رات کو شراب پیتا ہے اور دن میں مزدوروں کا خون چوستا ہے، ایسے لوگوں کو معاشرہ محض ان کے ظاہری اطوار اور رنگ ڈھنگ کی وجہ سے لبرل سمجھتا ہے حالانکہ ان سے زیادہ رجعت پسند کوئی نہیں۔ تاہم اگر حقیقی لبرل لوگوں کے اثر ورسوخ کا اندازہ لگانا ہو تو عورت مارچ کا آنجہانی خادم حسین رضوی کے جنازے سے تقابل کر کے دیکھ لیں، پتا چل جائے گا کہ زمانہ کس کا طرفدار ہے! قابل احترام مفتی صاحب نے جمہوریت کا حوالہ بھی دیا تو یہ سوال تو میرا بھی ہے کہ اگر کوئی شخص مخالف نقطہ نظر کا اظہار کرے تو اسے نام نہاد لبرل اور 'روغن خیال' کہہ کر بحث کو 'ادھر تم، ادھر ہم

کا رخ دینا کیا مناسب بات ہے؟

اس سے تاثر یہ ملتا ہے جیسے مذہب کی تشریح کرنے میں کوئی دوسرا مسلمان اگر ان سے اختلاف کرے گا تو نام نہاد لبرل کہلائے گا لہذا اس ضمن میں جو legitimacy مفتی صاحب کو حاصل ہوگی وہ اس دوسرے مسلمان کے پاس نہیں ہوگی۔ حالانکہ جمہوریت، جس کے مفتی صاحب بھی قائل ہیں، میں ہر شخص کی رائے برابر وزن رکھتی ہے۔ اور اس بات کی تو مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ اختلاف رائے پر میں مخالف کی آواز دبانے کا حامی ہوں۔ یہ کب ہوا؟ اختلاف رائے پر آواز دبانے کی 'ٹیکنالوجی' جس طبقے کے پاس ہے اس سے مفتی صاحب بخوبی واقف ہیں، وہ طبقہ جب چاہتا ہے کسی فلم پر پابندی لگوا دیتا ہے اور جب چاہتا ہے شہر کا شہر بند کروا دیتا ہے۔ مفتی صاحب اپنے لیے تو گنجایش کے طلب گار ہیں مگر فدوی کو غالب جتنی رعایت دینے کے لیے بھی تیار نہیں "گو وہاں نہیں پہ وہاں سے نکالے ہوئے تو ہیں، کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی۔" مفتی صاحب نے سوال کیا ہے کہ "یہ کہاں سے لازم آیا کہ برسر عام شراب نوشی اور نامحرم لڑکے لڑکیوں کا اختلاط اور ساتھ رہنا مادی ترقی کے لازم وملزوم ہیں۔" پھر وہی خلط مبحث، میں تو یہ بات سرے سے لکھی ہی نہیں، نہ میری یہ دلیل ہے۔ مفتی صاحب کو یہ سوال تو امارات کے حکمرانوں سے پوچھنا چاہیے، انہوں نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ پاکستان میں نکاح کے بغیر ساتھ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ کچھ لوگ تو نکاح کر کے بھی ساتھ نہیں رہنا چاہتے! مفتی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ تصویر، دخانی انجن اور آلہ متکبر الصوت کے استعارے گھس پٹ چکے ہیں۔ گزارش یہ ہے کہ یہ استعارے نہیں تاریخی حقائق ہیں۔ کوئی بات محض اس لیے گھسی پٹی نہیں ہوتی کہ وہ پرانی ہو جاتی ہے، گھسی پٹی وہ تب کہلاتی ہے جب اس کا تسلی بخش جواب بار بار دیا جا چکا ہو۔ اور اس بات کا جواب دیا جانا ابھی باقی ہے کہ کیوں اس دور میں یہ فتاویٰ دیے گئے، اگر وہ فتاویٰ درست تھے تو آج مفتی صاحب ان پر عمل کیوں نہیں کرتے/کرواتے اور اگر درست نہیں تھے تو اس بات کی کیا ضمانت کہ جس چیز کو آج خلاف مذہب قرار دیا جا رہا ہے کل کو یہی علما اسے جائز قرار نہیں دیں گے؟ وما علینا الا البلاغ المبین (اور نہیں ہے ہم پر کوئی اور ذمہ داری، سوائے (اللہ کا پیغام) صاف صاف پہنچا دینے کے۔ (القرآن، 36/17)۔"

کالم کی دم: میں مفتی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ ان کی بدولت آج کالم کا موضوع سوچنے کی ذہنی کوفت سے بچ گیا۔ ویسے بھی جس روز میں بونگ کلچوں کا ناشتہ کر لوں، اس دن میں مراقبے میں چلا جاتا ہوں اور کالم لکھنے کو دل نہیں کرتا۔ مفتی صاحب جب بھی لاہور آئیں تو فدوی کو میزبانی کا موقع دیں، مجھے یقین ہے کہ لاہور کے بونگ کلچے کھانے کے بعد وہ اپنے کالموں میں غالب کے اس قسم کے شعر بھی لکھا کریں گے کہ "اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ، چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے!"

مکرم عبدالکریم قدسیؔ صاحب کے لیے ایک اور پنجابی ایوارڈ

مکرم عبد الکبیر قمر صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ میر فاونڈیشن لاہور پاکستان کے زیر انتظام (میر پنجابی میلہ) کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں پنجابی ثقافت کے رنگ نمایاں کیے جاتے ہیں اور پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے مختلف پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اسی میر پنجابی میلہ) میں سال بھر کے دوران پنجابی زبان میں شائع ہونے والی ان کتابوں پر (علی ارشد میر ایورڈ) دیا جاتا ہے جنہوں نے پنجابی ادب میں نمایاں کردار ادا کیا ہوتا ہے۔ اس سال (میر پنجابی میلہ 2020ء) 26 اور 27 دسمبر 2020ء کو اوپن ایئر تھیٹر باغ جناح لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میلہ میں پنجابی بال ادب کا (علی ارشد میر ایورڈ) اردو اور پنجابی کے معروف شاعر مکرم عبد الکریم قدسیؔ صاحب کی کتاب (گوماں دا گلاب) کو دیا گیا۔ 26 دسمبر 2020ء کو منعقد ہونے والی تقریب میں یہ ایوارڈ مکرم عطاء العزیز صاحب نے وصول کیا۔

یاد رہے اس سے قبل مکرم قدسیؔ صاحب کو مسعود کھدر پوش ایوارڈ، پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ، حرفِ نوا ایوارڈ، ساغر صدیقی ایوارڈ اور پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے (بہترین گیت نگار) کے ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔

اسلام کا حقیقی تصور جہاد

تحریر: ابن قدسی

موجودزمانے میں جب بھی کسی کے سامنے ''جہاد'' لفظ بولا یا پڑھا جاتا ہے تو عموماً ذہن میں ایک خاص حلیہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔اس کے ساتھ ہی دہشت اور خوف کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ایسا لگتا ہے یہ لفظ اپنے ساتھ جہالت اور بے علمی لیے ہوئے ہے۔اس لفظ کے استعمال سے خودکش حملہ آور نکل کر باہر آجائے گا نہ ہوا تو گولیوں کی آواز تو لازمی آئے گی۔پھر جلی کٹی لاشیں ہونگی،خون ہی خون ہو گا اور اس کے ساتھ نعرہ تکبیر کی صدا بلند ہوگی۔''جہاد'' کا یہ تصور فلموں اور ٹی وی سکرینوں پر بھی نظر آتا تھا لیکن اب حقیقت میں اتنا دیکھا جا چکا ہے کہ فلمیں شاید پیچھے رہ گئیں ہیں۔

''جہاد'' کے اس تصور کا مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ اس تصویر میں رنگ بھرنے کے لیے دشمنوں اور دوستوں دونوں کا برابر کا حصہ ہے۔دشمنوں نے اس تصویر کو بنا کر پیش کیا تو اس کے اپنوں نے اسی ''جہاد'' کا نام لے کر اس تصویر کے نقش ونگار کو واضح کیا جس سے ''جہاد'' کی وہ بھیانک تصویر مکمل ہوئی اور اسی سے اسلامی حقیقی تصور جہاد نفرت اور خوف کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کھو گیا۔جہاد کے متعلق بنائی گئی تصویر اور اپنوں کے رنگوں نے اسلام کو پوری دنیا میں بدنام کیا۔اسلام کی ساری اچھائیاں دشمنوں کی نفرت اور اپنوں کی غلط محبت کے نیچے چھپ گئیں۔اسلام کو ایسا نقصان پہنچا جو شاید پہلے کبھی نہیں پہنچا۔کس کا قصور ہے؟اس سوال کا جواب تلاش کرنے نکلیں تو شاید کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔دشمن تو ہوتا ہی دشمنی اور سازشیں کرنے کے لیے لیکن اسلام کا نام لینے والوں نے جہاد کا نام لے کر غیروں کی گردنیں بھی کاٹیں اور اپنوں کا بھی خون بہایا ہے اور یہ سب کچھ نعرہ تکبیر کی صدائیں بلند کرتے ہوئے ہوا۔اسلام کی سربلندی کا نام لے کر نیام سے تلوار نکالی اور اسے استعمال کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا گیا کہ وہ اسلام دشمن کی گردن ہے یا اسلام کا نام لینے والی کی بس تلوار گردنیں کاٹی چلی گئی۔تلوار کبھی استعمال کرنے والے کی نیت نہیں دیکھتی۔وہ نکلتی ہے کاٹنے کے لیے۔بس جس میں مہارت اور طاقت ہوئی تلوار نے گردن کاٹ دینی ہے۔بھیانک پہلو یہ ہے کہ جو تلوار نعرہ تکبیر سے بلند ہو کر کسی کلمہ گو کی گردن کاٹ دے تو پھر نہ نعرہ تکبیر معتبر رہتا ہے اور نہ کلمہ جائے امن۔پھر ایسا خون بہتا ہے جسے دیکھ کر دشمن کی خوشی نادیدنی ہوتی ہے۔وہ اپنی فتح کے شادیانے بجاتے ہیں جو کام ان کی تلوار نے کرنا تھا وہ کام نعرہ تکبیر کی تلوار نے کر دیا۔اسلام کی پندرہ صدیوں پر محیط تاریخ میں کئی ایسے مواقع موجود ہیں جہاں اسلام دشمن قوتوں نے خوشیوں کے شادیانے بجائے۔افسوس ناک صورتحال یہ ہے کہ پندرہ صدیوں میں مسلمان دشمنوں نے مسلمانوں کا اتنا خون نہیں بہایا جتنا اسلام کا نام لے کر کلمہ پڑھنے والوں نے کلمہ پڑھنے والوں کا بہایا۔

جہاد کے متعلق اسلامی تصور انتہائی معتبر اور متبرک تصور ہے جس پر حاشیہ برادروں نے اتنے حاشیہ چڑھا دیئے ہیں کہ حقیقی تصور نظر ہی نہیں آتا۔سب سے پہلے جہاد کے لفظ کو ہی نہیں سمجھا گیا۔

جہاد کے لغوی معنی

جہاد۔جہد سے مشتق ہے اور جہد کے معانی ہیں مشقت برداشت کرنا اور جہاد کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے میں پوری طرح کوشش کرنا اور کسی قسم کی کمی نہ کرنا۔(تاج العروس)

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب لکھتے ہیں:۔

''جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں۔مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں''

(سیرۃ النبی جلد ۵ صفحہ ۲۱۰ طبع اول۔دارالاشاعت کراچی نمبر ۱)

کسی بھی کام کو اچھے طریق سے کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔بیٹھے بیٹھائے تو کامیابیاں نصیب نہیں ہوتیں۔اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے بھی کوشش کرنی پڑتی ہے۔

جہاد فی سبیل اللہ

اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا یعنی کوشش کرنا۔یہ کوشش حقوق اللہ سے شروع ہوتی ہے اور حقوق العباد تک پھیل جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی عبادت مکمل اور پورے تقاضوں کے ساتھ بجالانے کوشش بہت وسیع ہے۔پنج وقتا نماز کا التزام ہی اپنی ذات میں جہاد چاہتا ہے۔پھر نفلی عبادات کی ادائیگی،تہجد نفس کو زیر کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سفر میں سب سے بڑی روک انسانی نفس

ہے۔ ہزار ہا نفسانی خواہشات اللہ تعالیٰ کے قرب سے دور کرنے کے لیے سر اٹھاتی ہیں۔ ان کو دبانا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے زیر نگیں کرنا سب سے بڑا جہاد ہے۔ قدم قدم پر ایک امتحان ہوتا ہے۔ نفسانی خواہشات عارضی خوشی کو حقیقی خوشی کی صورت میں پیش کر کے گمراہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس موقع پر سیدھے راستے پر رہنا ایک مجاہدہ چاہتا ہے کیونکہ نفس بار بار اپنی سفلی خواہشات کی تکمیل پر اکساتا ہے۔ حقیقی مومن اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے ان تمام مراحل سے گزر کر اللہ کے حضور حاضر ہو جاتا ہے۔ حقوق العباد کی ادائیگی ہے یہ اپنی ذات میں بہت بڑا مجاہدہ ہے۔

جہاد کے تصور کو حقیقی رنگ میں سمجھنے کے لیے حقیقی علماء اس کی چار اقسام بیان کرتے ہیں۔

جہاد کی اقسام

قرآن اور حدیث سے جہاد کی چار بڑی اقسام ثابت ہوتی ہیں۔

۱۔ نفس اور شیطان کے خلاف جہاد

۲۔ جہاد بالقرآن یعنی دعوت و تبلیغ

۳۔ جہاد بالمال

۴۔ جہاد بالسیف (دفاعی جنگ)

نفس اور شیطان کے خلاف جہاد

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:70)

ترجمہ: اور وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کو ضرور اپنے رستوں کی طرف آنے کی توفیق بخشتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ایک غزوہ سے واپسی کے موقع پر فرمایا۔

''تم جہاد اصغر یعنی چھوٹے جہاد سے لوٹ کر جہاد اکبر یعنی بڑے جہاد کی طرف آئے ہو (اور جہاد اکبر) بندہ کا اپنی خواہشات کے خلاف جہاد ہے''۔

(کنز العمال۔ کتاب الجہاد فی الجہاد الاکبر من الاعمال جلد ۴ حدیث ۱۱۲۶۰۔ مطبوعہ مکتبۃ التراث الاسلامی حلب)

جہاد بالقرآن

اس جہاد سے مراد یہ ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی فکر کی جائے نیز توحید کے قیام کے لئے بھرپور کوشش کی جائے اور قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۳)

ترجمہ:۔ پس تو کافروں کی بات نہ مان اور اس (یعنی قرآن کریم) کے ذریعہ سے ان سے جہاد کر۔

جہاد بالمال

اللہ تعالیٰ کی راہ میں دین کی اشاعت کے لئے مال خرچ کرنے کو بھی جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اس جہاد کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے

وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (التوبہ: ۴۱)

ترجمہ:۔ اور اپنے اموال اور جانوں کے ذریعہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔

جہاد بالسیف یا دفاعی جنگ

جہاد کی چوتھی قسم دفاعی جنگ یا جہاد بالسیف ہے یعنی جب دشمن دینی اقدار کو ختم کرنے اور دین کو تباہ و برباد کرنے کے لئے دین پر حملہ آور ہو تو اس وقت دفاعی جنگ کرنے کو جہاد بالسیف کہتے ہیں۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے جہاد اصغر قرار دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۔ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج:۴۰۔۴۱)

ترجمہ: یعنی وہ لوگ جن سے (بلاوجہ) جنگ کی جا رہی ہے ان کو بھی (جنگ کرنے کی) اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے (یہ وہ لوگ ہیں) جن کو ان کے گھروں سے صرف ان کے اتنا کہنے پر کہ اللہ ہمارا رب ہے بغیر کسی جائز وجہ کے نکالا گیا۔

علماء نے دفاعی جنگ کی بعض شرائط بیان کی ہیں جن کی موجودگی کے بغیر یہ جہاد جائز نہیں۔ چنانچہ سید نذیر حسین صاحب دہلوی لکھتے ہیں:۔

''جہاد کی کئی شرطیں ہیں جب تک وہ نہ پائی جائیں جہاد نہ ہوگا''

(فتاویٰ نذیریہ جلد ۳ کتاب الامارۃ والجہاد صفحہ ۲۸۲۔ ناشر اہل حدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور)

مولانا ظفر علی خان صاحب ایڈیٹر اخبار زمیندار لاہور نے درج ذیل شرائط کا ذکر کیا ہے:۔

''۱۔ امارت

۲۔اسلامی نظام حکومت

۳۔ دشمنوں کی پیش قدمی وابتدا'' (اخبار زمیندار ۱۴ جون ۱۹۳۴ء)

خواجہ حسن نظامی نے جہاد کے لئے

۱۔کفار کی مذہب میں مداخلت

۲۔امام عادل

۳۔حرب وضرب کے سامان کے ہونے کا ذکر کیا ہے۔رسالہ شیخ سنوسی)

مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے لکھا کہ:۔

۱۔مسلمانوں میں امام وخلیفہ وقت موجود ہو ۲۔مسلمانوں میں ایسی جمیعت حاصل جماعت موجود ہو جس میں ان کو کسر شوکت اسلام کا خوف نہ ہو۔

(الاقتصاد فی مسائل الجہاد از مولوی محمد حسین بٹالوی صفحہ ۵۱۔۵۲۔مطبع وکٹوریہ پریس)

خلاصہ یہ کہ علماء کے نزدیک جہاد بالسیف کے لئے پانچ شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے اوران میں سے کسی ایک کے بھی نہ ہونے سے دینی قتال نہیں ہوسکتا اور وہ شرائط یہ ہیں کہ ۱۔امام وقت کا ہونا ۲۔اسلامی نظام حکومت ۳۔ہتھیار ونفری جو مقابلہ کے لئے ضروری ہو ۴۔کوئی ملک یا قطعہ ہو ۵۔دشمن کی پیش قدمی اور ابتداء۔

اب موجودہ زمانے میں جہاد کی باقی تینوں اقسام پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا جہاد بالسیف پر زور ہے۔حالانکہ پہلی تینوں اقسام کا تعلق ہر ایک کے اپنے نفس کے ساتھ ہے اور یہ محنت اور کوشش کو چاہتا ہے اور ساری زندگی پر محیط ہے۔نفسانی خواہشات کی تکمیل تو چاہتا ہے لیکن اسے خدا تعالیٰ کے احکامات کے تابع کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔مال تو انسان کو ویسے ہی بہت پیارا ہوتا ہے اسے اللہ کے راستے میں قربان کرنا بھی مشکل امر ہے۔قرآن تعلیمات کی روشنی میں کوششیں بھی محنت کو چاہتی ہیں ۔تلوار سے تو دوسرے کی گردن کاٹنی ہے۔یہ کام نسبتاً آسان سمجھا جاتا ہے۔نعرہ لگاؤ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور گردن دوسرے کی کاٹ دو۔محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی گردن نہیں جھکانی۔بس اب یہی تصور ''جہاد'' باقی رہ گیا ہے۔

کیا اب اس زمانے میں اسلام کے لیے تلوار اٹھانی چاہیے؟

یہ بہت اہم سوال ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تلوار اٹھائی گئی۔کیا اب وہ وجہ قائم ہے؟ کیا اب بھی جہاد بالسیف کا زمانہ ہے؟ جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسلام کے لیے تلوار اٹھانی پڑی موجودہ زمانے میں اس طرح تلوار اٹھانے کی ضرورت نہیں۔یہ جملہ حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرنے والوں کے لیے ناقابل قبول ہو لیکن حقیقت تک پہنچنے کے لیے سنجیدگی کے ساتھ حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے ورنہ جذبات اصل تعلیم تک پہنچنے نہیں دیں گے۔

ابتدائی زمانے میں اسلام کے نام پر تلوار کیوں اٹھائی گئی؟ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔جس زمانے میں اسلام عرب میں آیا۔وہاں قبائلی نظام تھا۔اس زمانے کی جمہوریت یہی تھی کہ قبائل اپنی طاقت کے بل بوتے پر زندہ تھے۔اپنی حفاظت بھی خود ہی کرنی،۔انصاف لینا ہے تو خود ہی لینا،ظلم کا بدلہ بھی لوگوں کے اپنے ذمہ تھا۔یہی اس زمانے کا نظام تھا۔کہہ سکتے ہیں اس زمانے کی جمہوری روایات ہی ایسی تھیں۔اس کو کوئی نظام کے خلاف نہیں سمجھتا تھا بلکہ کمزور کے متعلق یہ خیال تھا کہ اسے جینے کا حق نہیں۔اس پر جو مرضی ظلم کرلو وہ جائز ہے۔اس زمانے کا نظام یا جمہوری روایات اسی طرح جاری تھیں۔اگر اس زمانے میں اسلام تلوار ہاتھ میں لیتا تو اس کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔اس زمانے کا نظام اسلام کو تلوار اٹھانے کی پوری اجازت دیتا تھا حالانکہ تلوار اسلام کے مزاج میں داخل نہیں۔اسلام تو ہے ہی امن وسلامتی کا نام لیکن اس زمانے میں مجبوراً تلوار اٹھانی پڑی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانے کے جمہوری نظام نے اسلام کو تلوار کے استعمال پر مجبور کیا۔اُس زمانے میں تلوار اٹھانے کو کوئی خلاف نظام تصور نہیں کرتا تھا کیونکہ اُس زمانے کی جمہوریت ہی ایسی تھی۔

آج کے زمانے میں یہ سب ذمہ داریاں ہر ملک کی حکومت نے اٹھائی ہوئی ہیں۔انصاف کے لیے عدالتیں موجود ہیں۔ظلم روکنے کے لیے پولیس یا دیگر حکومتی ادارے موجود ہیں۔موجودہ زمانے میں جمہوری روایات یہی ہیں کہ یہ سب کام حکومت کے ہیں۔اب ہر شخص کو اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا خود بدلہ لینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ قانون کے دائرے میں رہ کر نظام عدل انصاف مہیا کرتا ہے۔آج خود بدلہ لینا خلاف قانون ہے۔

اب جہاد بالسیف اور تلوار کو جزوء ایمان کا تصور پیش کرنے والے مثال گزشتہ زمانے کی دیتے ہیں لیکن کبھی اس زمانے کے نظام پر بحث نہیں کرتے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اپنے دفاع یا قیام امن کے لیے تلوار اٹھانا خلاف قانون نہیں تھا لیکن موجودہ زمانے میں کسی نظام حکومت سے ہٹ کر اپنے طور پر تلوار اٹھانا خلاف قانون ہے۔اسلام قانون پر عمل درآمد کی تعلیم دیتا ہے۔

شہداء ہی شہید ہوتے ہیں

تحریر: نذر حافی

تلوار اور گولی سے مرنا شہادت نہیں ہے، شہادت کا انحصار آلہ قتل پر نہیں، بہت سارے لوگ روزانہ قتل ہوتے ہیں لیکن شہید نہیں ہوتے۔ شہادت، زندگی کو خالق و مالک کے حوالے کر دینا ہے۔ اگر زندگی کو ہم نے اپنے معبود کے حوالے نہیں کیا تو پھر فقط تلوار لگنے سے شہادت بھی نہیں ملتی۔ مالِ غنیمت اور کشور کشائی کی بھینٹ چڑھنے والی جانیں شہید نہیں ہوتیں۔ بقولِ اقبال رحمۃ اللہ

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شہادت آرزو نہیں مطلوب ہے، تمنا نہیں مقصود ہے، جادہ نہیں منزل ہے اور قالب نہیں روح ہے۔ ہماری طرح اس کی خواہش کرنے والے بہت ہیں، اس کی تلاش میں بسترِ فراش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والوں کی تعداد ان گنت ہے، لیکن یہ گوہرِ مراد فقط انہی کو حاصل ہوا جو مادی حیات میں جیتے جی شہید ہو گئے۔ مادی زندگی میں جو شہید ہوا، شہادت اُسی کو نصیب ہوئی۔ جو اِس دنیاوی اور مادی زندگی میں شہید نہیں ہوتا، اُسے شہادت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جو اپنے نفس کے بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتا رہتا ہے، وہ معراجِ شہادت پر فائز نہیں ہو پاتا۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے کہ شہید سے قبر میں کسی قسم کی باز پُرس نہیں ہوگی۔ اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قبر میں حساب کتاب اُن کا ہوگا، جن کے ذمے بقایا ہے۔ بھلا جو اس دنیا میں ہی اپنا حساب بے باق کر کے جائے، اُس سے حساب کیسا!۔ ایک دوسری جگہ حدیثِ رسول ﷺ ہے کہ اللہ نے شہید کو سات امتیازات عطا کئے ہیں۔ ان سات میں سے ساتواں امتیاز زیارتِ خداوندِ متعال ہے، یعنی اگر ایک انسان اپنی اس زندگی میں ریاکاری کرتا ہے، وجہ اللہ کے بجائے طرح طرح کے مفادات پر نظر رکھتا ہے، اور ہوائے نفس کو اپنا رب بنا لیتا ہے تو ایسا شخص قصاب کے ٹوکے سے مارا جائے یا کسی کی گولی سے، اُسے شہید نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جو شخص خدا کی راہ میں سرحدوں کی حفاظت یا جہاد کے لئے گھر سے نکل جاتا ہے۔ اس کے لئے اٹھائے گئے ہر قدم پر سات لاکھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں، اس کے سات لاکھ گناہوں کو مٹایا جاتا ہے اور اس کے سات لاکھ درجات بلند ہوں گے۔ وہ اس وقت تک خدا کی حفاظت میں رہتا ہے، جب تک کہ وہ مر نہیں جاتا ہے اور اُسے جیسے بھی موت آئے، وہ شہید ہے اور اگر وہ محاذ سے واپس آ جاتا ہے تو گناہوں سے معاف شدہ ہے اور اس کی دعا مستجاب ہے۔

قارئینِ کرام توجہ فرمائیں! جو شخص راہِ خدا میں نکل جاتا ہے، وہ پھر شہید ہے، چاہے جس طرح بھی اُس کی موت ہو۔ لیکن جو راہِ خدا میں مخلص ہی نہیں ہوا۔ جو اپنے گناہوں پر نادم ہی نہیں ہوا، جس نے حقوق الناس اور حقوق اللہ کو اہمیت ہی نہیں دی۔ اُس کا شہادت سے کیا تعلق۔ شہید وہ لوگ ہوتے ہیں، جو اپنی زندگیوں کو خدا کی اطاعت اور مخلوقِ خدا کی بھلائی اور رہنمائی کیلئے وقف کر دیتے ہیں۔ جو جب تک زندہ رہتے ہیں تو اُن کی ذات کا فیض سبیل کی طرح رواں دواں رہتا ہے، وہ جب مسکراتے ہیں تو یتیموں اور بیواؤں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے، وہ جب بات کرتے ہیں تو مظلوموں کی ترجمانی ہوتی ہے، اُن کے ماتھے کی شکن سے ظالموں کے دِل دہلتے ہیں، ان کے جوتوں کی نوک سے فرعونوں کے تاج لرزتے ہیں، ان کی گفتگو سے جبر و استبداد کی زنجیریں ٹوٹتی ہیں۔ وہ جب اِس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں تو کبھی اُن کی لاشوں پر گھوڑے دوڑا دیئے جاتے ہیں، کبھی اُنہیں رات کی تاریکی اور تنہائی میں دفن کیا جاتا ہے، کبھی اُن کے مسموم بدن پر ہتھکڑیوں کے نشان ملتے ہیں اور کبھی اُن کے جنازے سیلِ بلا بن کر اُمڈتے ہیں۔ یہ زندگی میں یتیموں کے منہ میں نوالے ڈالتے ہیں، اپنے کاندھوں پر مساکین کیلئے اناج اٹھا کر لے جاتے ہیں، اِن کی قوتِ بازو سے فقیروں کے چولہے جلتے ہیں اور ان کے آہنی سینے کمزوروں کی سپر بنتے ہیں۔ جب ہماری زندگی میں یہ رنگ نہیں، جب چال چلن میں یہ ڈھب نہیں، جب سوچ میں یہ وسعت نہیں، جب عمل میں یہ خلوص نہیں تو پھر فقط نعروں سے شہادت نصیب نہیں ہوتی۔ اگر آج ہمارے گھر سلامت ہیں، ہماری عزتیں محفوظ ہیں، ہماری ناموس بچی ہوئی ہے، ہمارے ہاں فوجیوں کے گلے کاٹ کر فٹبال نہیں کھیلے جاتے، اگر داعش کے جنات ہمارے ملک پر قبضہ نہیں کر سکے۔ اگر طالبان اور القاعدہ کے خونخوار وحشی سانحہ اے پی ایس کو تکرار نہیں کر سکے تو یہ سب ویسے ہی نہیں ہو گیا، یہ اُن کے خلوص کا ثمر ہے، جو دن رات مختلف محاذوں پر ہماری حفاظت کیلئے کمر بستہ ہیں۔ اگر آج ہماری سرحدیں سلامت، دفاع مضبوط اور ایٹمی اثاثے محفوظ ہیں، اگر ہمارے بچے سکون سے اسکول جاتے ہیں، ہماری بچیوں کے اسکولوں کو بموں سے نہیں اُڑایا جاتا، ہماری عبادت گاہوں سے فرقہ واریت کے عفریت کو نکال دیا گیا ہے اور ہمارے ہاں امن و سکون کی واپسی ممکن ہوئی ہے تو اس میں نائیک سیف علی جنجوعہ شہید، کیپٹن محمد سرور شہید اور کم سن طالب علم اعتزاز حسن شہید سے لے کر شہید قاسم سلیمانی جیسوں کی مخلصانہ قربانیوں کا ہی عمل دخل ہے۔ شہید قاسم سلیمانی نے شہداء کی نشانی یہ بتائی تھی کہ (شرط شہید شدن، شہید بودن است۔ اگر امروز بوی شہید از رفتار و اخلاق کسی استشمام شد، شہادت نصیبش می شود۔ تمام شہداء دارای این مشخص ھستند) یہ جملہ رہتی دنیا تک عرفاء و شہداء اور مجاہدینِ اسلام کے ہاں زیرِ بحث رہے گا، اپنے اپنے ظرف کے مطابق ادباء اور مترجمین اس کے تراجم اور تفاسیر کرتے رہیں گے۔ تاہم ایک سال تک مسلسل سوچنے کے بعد مجھے اس کا جو مفہوم سمجھ آیا، وہ سادہ الفاظ میں کچھ یوں ہے کہ "شہید ہونے کی شرط اِس زندگی میں شہید بننا ہے۔ اگر آج کسی کے طرزِ عمل اور اخلاق سے اخلاص کی خوشبو آئے تو وہی شہید ہوگا۔" اپنے دانشمند طبقے کی زبانی حاصلِ کلام یہ ہے کہ شہداء ہی شہید ہوتے ہیں۔ جی ہاں آج ہی شہید ہو جائیں، تاکہ کل کو شہید ہو سکیں۔

ابن عربی کا روحانی فیضان

تحریر: غلام شبیر

ابنِ عربی علم اور معرفت میں امتیاز کرتے ہیں؛ بلکہ آخر الذکر کو بلند مقام دیتے ہیں۔ ان کے ہاں معرفت بہ راہِ راست خدا کی دین ہے جس کا ذریعہ کشف، مشاہدہ اور روحانی بصیرت ہے۔ معرفت، علم کی وہ شکل ہے جو روح کی پاکیزگی اور روحانی عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا حصول کتاب پڑھنے، یا کسی استاد سے اِکتساب سے ممکن نہیں۔ اس لیے ابنِ عربی صوفیاء کو روشن نُفُوس کہتے ہیں جو علمِ معرفت اور اس کے حامل عارفین کو جانتے ہیں۔ انسان میں کائنات کی بکھری چیزوں سے مشابہت اختیار کرنے کی صلاحیت ہے جو بہ ذاتِ خود انسان کی تخلیقی فطرت کا ثبوت ہے۔ ابن عربی کے نزدیک پہلے پہل یہ کائنات غیر منقسم تھی۔ یہاں پر کوئی سرگرمی نہ تھی۔ پھر اس نے اس پوری کائنات میں اپنے خدائی حکم سے اپنی مقدس تجلی ڈالی جس کے بعد موجوداتِ عالم خدائی ہو گیا۔ حضرتِ آدمؑ میں خدائی روح پھونکنے کی وجہ بھی یہی تھی: یعنی کہ خدا اپنا آپ ظاہر کر سکے۔ گویا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان اپنے شعور اور تخلیقی فطرت سے ذاتِ باری تعالیٰ کو جانتا ہے۔ ابتداء ہی سے اِس میں تخلیق کی روح پھونکی گئی، جس کے بعد اسے قوموں اور قبائل میں تقسیم کر دیا گیا اور یوں انسان کی اس تخلیقی فطرت کو خدا کی طرف ترغیب کا ابتدائی اور اہم عُنصر بنا دیا گیا۔ ابن عربی کے روحانی فیضان سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کا عمل شعور کو جگا کر اسے نشو و نما دیتا ہے۔ اسی طرح انسان کا مقصدِ حیات قرآنِ مجید میں خدا کے اس بیان کی طرف مراجعت کرنے سے بتاتے ہیں: فاطر السمٰوات والارض

القاموس الجدید عربی۔ اردو لغت میں فاطر کا مطلب پیدا کرنے والا، شَق کرنے والا کے ہیں؛ یعنی کہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا یا علیحدہ کرنے والا۔

اب اگر دیکھا جائے تو اس کائنات یعنی آسمانوں و زمین اور اس میں شامل موجودات میں خدائی خاکے ہیں، یا اس کا عکس ہے، اور اسی طرح انسانیت میں اس کا عکس، یا خاکہ ہے یعنی ابن عربی کے نزدیک انسان خدا کا مظہر ہے۔ اسی طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی محرک کی وجہ یہی تخلیقی عمل ہے اور یہ کہ تخلیق کی ابتداء ہی میں ہر بچے نے خدا کے ہاں ایک عہد کیا تھا؛ مذہب کو منطقی رنگ دینے سے پہلے پہلے۔ اسی طرح یہ بات حدیث میں بھی آئی ہے کہ بچے اپنی فطرت پر پیدا ہوتے ہیں؛ یہ ان کے والدین ہوتے ہیں جو انھیں عیسائی، یہودی، یا مجوسی بناتے ہیں۔ جو اپنی اسی فطرت کی بناء پر اس خدائی یک رنگی اور اور انسانیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ کہ خدا کی یہ تجلی موجودات کائنات کی فطرت کا خاصہ ہے۔ نظریۂ وجود میں موجودات کی فطرت میں کمپوزیشن اور اس کی بڑھوتری پائی جاتی ہے۔

عربی میں وجود کا مطلب پانا یا ملنا کے ہیں۔ خالص وجود کی نسبت اکیلے خدا کی طرف ہے، جب کہ انسانوں کا وجود مٹ جانے والا ہے اس لیے وہ حقیقت اصلی یا خدائی وجود کی طرف لوٹ کر خود کو پاتا ہے۔ ابن عربی کے نزدیک انسانوں نے خدا کی طرف لوٹنے کا قول و قرار کیا ہوا ہے جو خدا کی طرف دائمی تعلق استوار کرتا ہے۔ اب انسان میں مراجعتِ ربانی کی وجہ مقدس روح کا نفوذ ہے جو ان کی سرِشت میں شامل ہے، اور کائنات میں موجودات کو وجود میں لانے کا مقصد یہ تھا تا کہ خدا اور اس کی خدائی کو جانا جائے۔

فارسی شعروادب کی تاریخ اور نمایاں شخصیات

تحریر: خرم سہیل

فارسی اور عربی ادبیات کی تواریخ بہت پرانی ہیں۔ان کو پڑھنے کے لیے کئی صدیوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔فی الوقت...

فارسی اور عربی ادبیات کی تواریخ بہت پرانی ہیں۔ان کو پڑھنے کے لیے کئی صدیوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔فی الوقت ہمارے موضوع کا مدار فارسی شعروادب ہے،لہٰذا یہ دیکھنا ہے کہ فارسی زبان میں شعروادب نے تخلیق کے مدارج کیسے طے کیے۔ہمیں اس کے لیے ساتویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک مختصر جائزہ لینا ہوگا۔یہ فارسی شعرائے کرام اور ادیبوں کی مختلف ادوار میں تخلیقی سرگرمیوں کو بامِ عروج تک پہنچانے کی داستان ہے۔تصوف کے سفر کا بھی تذکرہ ملے گا۔ہم جب فارسی شعروادب کی بات کررہے ہیں،تو اس سے مراد کسی مخصوص خطے یا ملک کے تخلیق کار سے نہیں ہے، بلکہ جہاں بھی فارسی زبان میں شعروادب تخلیق ہوا،اس کا یہاں تذکرہ ہے۔فارسی شعروادب کا اردو زبان اور ادبیات پر بھی خاصا گہرا اثر رہا ہے۔ساتویں اور آٹھویں صدی کے درمیانی عرصے میں فارسی زبان میں شاعروں، ادیبوں،عالموں کا ذکر ملتا ہے،ان میں چند اہم تخلیق کاروں میں،محمد ابن زکریا الرازی ،محمد ابن موسیٰ الخوارزمی،عبداللہ ابن المقفع ،بخاری،ابوبسر عمرو بن عثمان قنبر البصری اور بلاذری کے نام شامل ہیں۔یہ وہ شخصیات ہیں،جن کا ان دو صدیوں کے درمیانی زمانے میں بہت چرچا رہا اور انھوں نے فارسی شعروادب کی بنیاد رکھی۔فارسی شعروادب میں شخصیات کی اکثریت ایسی ہے،جنھوں نے شعروادب کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی نام پیدا کیا۔

اس صدی میں شعروادب میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں میں ''ابن المقفع'' کا نام سب سے پہلے آتا ہے،کیونکہ اس شعبے میں اتنا تخلیقی کام کرنے والی واحد شخصیت تھے جنھیں ترجمے کی صنف پر دسترس حاصل تھی۔انھوں نے عربی سے ایک معروف ادبی نثری تحریر کا شاندار ترجمہ کیا،وہی ترجمہ فارسی ادب میں پہلی نمایاں اور باقاعدہ کام کے طور پر سامنے آیا۔فارسی زبان میں یہ وہ پہلے رجحان ساز تخلیق کار تھے،جنھوں نے عربی ادب سے ترجمے اور ماخذات کو بڑی مہارت سے فارسی زبان میں منتقل کیا،اسی لیے قدیم فارسی کے مصنّفین میں انھیں ایک مکمل مصنف کے طور پر مانا جاتا ہے اسی دور میں راضی جیسا سائنسدان،طبیب۔خوارزمی جیسا ریاضی دان،البصری جیسا عربی لسانیات کا ماہر اور بلاذری جیسا مؤرخ اور امام بخاری جیسی مذہبی شخصیت بھی موجود تھیں۔نویں صدی نے تین ایسی شخصیات کو جنم دیا،جن کو فارسی شعروادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔اس عہد کی تین تخلیقی علامتوں میں شمار کیے جانے والوں میں،منصور اور بلخی کے نام سے دنیا واقف ہے۔ان تینوں نے شاعری، ادب، فلسفے کی مختلف جہتوں میں کام کیا۔فارسی زبان میں تصوف کا دور بھی درحقیقت یہی سے شروع ہوتا ہے اور پہلی نمایاں شخصیت کے طور پر منصور حلاج کا نام آتا ہے،جنھوں نے خود کو فنا فی التصوف کردیا۔وہ اور تصوف کی دنیا ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔جدید فارسی شاعری میں ''ابوعبداللہ جعفر ابن محمد رودکی'' پہلی نمایاں شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔یہ قدیم فارسی زبان میں کلاسیکی ادب کے خالق بھی مانے جاتے ہیں۔منصور حلاج کا نام برصغیر کے لوگوں کے لیے نیا نہیں تھا، ہمارے ہاں آج بھی تصوف کی نسبت سے ان کا نام بہت مقبول ہے۔تصوف کے بنیادی اساتذہ میں شمار کیے جانے والی یہ شخصیت انقلابی قلم کار تھی۔ایک صوفی کے طور پر ان کی زندگی عملی نمونہ بنی۔عباسی دور کے چند مقبول ترین ناموں میں سے ایک نام ان کا بھی ہے۔اسی طرح کئی جہتوں میں کام کرنے والے ''شاہد بلخی'' ایک شاعر ہونے کے ساتھ فلاسفر اور صوفی بھی تھے۔ان کو بھی اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام حاصل تھا۔دسویں صدی میں فارسی زبان میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔بہت سے نئے لکھنے والے سامنے آئے۔ہر شعبے میں ترقی ہونا شروع ہوگئی۔مجموعی طور پر پندرہ سے بیس شخصیات اس دور میں نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔جنھوں نے مختلف شعبوں میں نام کمایا،لیکن سب سے زیادہ شہرت جس شاعر نے حاصل کی ،اس کا نام ''فردوسی'' ہے۔ایران کی قومی داستان کے خالق ''حکیم ابوالقاسم فردوسی توسی'' نے فارسی شاعری میں بلند مرتبہ حاصل کیا اور دیگر زبانوں میں شاعری کرنے والوں پر بھی اپنی شاعری کے اثرات مرتب کیے۔

شاہنامہ فردوسی اس شاعر کا ایک ایسا شاہکار ہے،جس کو دنیا آج بھی ذوق وشوق سے پڑھتی ہے اور فردوسی کی شہرت دنیا میں جہاں بھی لوگ نظم اور داستان سے لگاؤ رکھتے ہیں،وہ ان کے نام سے واقف ہیں۔سلطان محمود غزنوی کے دور حکومت میں شہرت حاصل کرنے والے فردوسی کے ہم عصروں میں بھی بہت سے قابل شاعر،ادیب

اورصوفی موجود تھے۔ان ہم عصروں میں ،ابوسعید ابوالخیر، ابومنصور دقیقی، ابوالفضل بیہقی، فرخ سیستانی،کسائی مروزی، عیوقی، خواجہ عبداللہ انصاری اور دیگر تھے۔گیارہویں صدی سے فارسی شعروادب مزید مقبولیت کی بلند پرواز اڑنے لگا۔اس صدی میں کئی نامور شخصیات پیدا ہوئیں ،ان کی وجہ سے پوری دنیا میں فارسی ادب کوشہرت حاصل ہوئی۔ان میں تین شخصیات ایسی تھیں،جن کے علم کی چمک دمک سے فارسی شعروادب جگمگا اٹھا۔ان کے نام ''عمر خیام''،''امام غزالی''اور''داتا گنج بخش علی ہجویری'' ہیں۔ایک رباعی کا بادشاہ تھا۔دوسرے کو مذہبی فکروفلسفے پر مکمل دسترس حاصل تھی۔تیسرے اپنی ذات میں مکمل صوفی تھے۔تینوں اس صدی کی نمایاں شخصیت بن کرابھرے۔عمر خیام فلسفی، ریاضی دان، ماہر موسیقی، ماہر جغرافیہ اور خوب صورت خیالات کا مالک شاعر بھی تھا،جب کہ امام محمد غزالی کی شخصیت بھی ہمہ جہت تھی۔انھوں نے دینی علوم میں مہارت حاصل کی اوراپنی ذات میں ایک صوفی بھی تھے۔اسلامی فکروفلسفے پر کیا ہوا ان کا کام یادگار ہے۔اس حوالے سے غزالی اپنے عہد میں ایک رجحان ساز شخصیت ثابت ہوئے اوراپنی علم کی ایسی دھاک بٹھائی کہ آج تک اس کا اثر ہے۔داتا گنج بخش علی ہجویری کے مزار پر زائرین کا ہجوم آج بھی ان کی صوفی تعلیمات کا عینی شاہد ہے،انھوں نے اپنے عمل سے دین اسلام کو برصغیر کے خطے میں متعارف کروایا، پھران کے نقش قدم پر چل کر کئی اورصوفی بھی اسی خطے میں تشریف لائے۔بارہویں صدی میں بھی فارسی زبان پر زرخیزی کا موسم چھایا رہا اور کئی نامور شخصیات کی دریافت ہوئی۔اس عہد میں دوشخصیات نے دنیا بھر میں اپنے علم وفضل سے بے پناہ شہرت حاصل کی،ان میں ''فریدالدین عطار''اور''شیخ سعدی'' شامل ہیں۔فریدالدین عطار نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے، بلکہ ان کی شخصیت بھی صوفیانہ تھی،جس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی دکھائی دیتا ہے۔ایران کا یہ شاعر صاحب دیوان ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی علوم میں بھی تعلیم یافتہ تھا۔ان کے کام پر رومی کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔سعدی وہ شاعر ہے،جس کی شہرت صرف فارسی زبان تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان کی مقبولیت کا چرچا مغرب میں بھی ہے،جس طرح رومی کو وہاں دوبارہ سے دریافت کیا گیا ہے۔ان کے دیگر معاصرین میں نظامی، سنائی کے علاوہ کئی معروف نام بھی تھے۔فارسی زبان وادب میں یہ وہ دور ہے،جس میں ان کے علما عروج کی بلندیوں پر فائز ہیں۔تیرہویں صدی جس عالم اورصوفی کو سب سے زیادہ شہرت اورمقام ملا،ان کے نام امیرخسرو اورشمس تبریزی تھے۔ان دونوں شخصیات نے اپنے علم ومرتبے سے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔امیرخسرو نے علم موسیقی میں اپنی صلاحیتوں کا ایسا اظہار کیا کہ آج تک اس کے ثمرات انسانی جمالیات تک پہنچ رہے ہیں۔شمس تبریزی ایک ایسا صوفی شاعر جس نے رومی جیسے شاعر کی تخلیقات میں معاونت کی۔خود بھی ایک ذہین شخص تھے۔حال ہی میں ان کے مزار کو یونیسکو ورلڈ ہیریٹیج میں شامل کیا گیا ہے۔

چودہویں صدی کی سب سے مشہور اورقابل ترین شخصیت 'حافظ شیرازی' کی ہے۔ایران کے اس شاعر نے شاعری میں نئی جہتیں متعارف کروائیں اورشاعری کی دنیا میں اس کی پیروری کی گئی۔ان کے چاہنے والوں میں علامہ اقبال جیسا شاعر بھی شامل ہے۔ان کے معاصرین میں پندرہ ایسے ہم عصر شاعر اورعالم ہیں،جن کو فارسی زبان میں نمایاں اہمیت حاصل تھی۔اگلی چارصدیوں میں بھی فارسی زبان اپنی زرخیزی کے سبب چھائی رہی،مگر کچھ زوال بھی آیا۔علما اورشعرا کی تعداد میں کچھ کمی آئی۔

اس سارے دور میں پھر بھی ایک شاعر ایسا تھا،جس نے ان چارصدیوں کی شخصیات میں خود کو نمایاں کیا۔یہ صرف صوفی شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہترین موسیقار اورادیب بھی تھے۔ان کی تقریباً آٹھ کتابیں ہیں،جن کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور یہ بہت مشہور ہیں۔اس دور تک آتے آتے فارسی شاعری دیگر ملکوں کے شعروادب پر بھی اپنے اثرات مرتب کر چکی تھی۔لہٰذا اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے دوبڑے شاعر بھی فارسی زبان کی اس تخلیقی لہر سے متاثر ہوئے،وہ مرزا اسد اللہ خان غالب اورعلامہ اقبال ہیں۔ان کے دیگر معاصرین میں بھی کافی شاعروں نے شہرت حاصل کی،مگر جو مرتبہ ومقام ان دونوں کے حصے میں آیا،وہ قدرت کسی کو کم کم ہی نوازتی ہے۔

بیسویں صدی میں سو سے زائد ایسی شعروادب کی شخصیات ہیں،جنھیں اپنے شعبوں میں مہارت حاصل ہے اور وہ عالمی سطح پر مقبول بھی ہوئے،ان میں علی شریعتی،فروغ فرخ زاد،سہراب،احمد شاملو،ایرج مرزا،وارند،محمد میلماسی سمیت کئی بڑے نام ہیں،جن کے علم سے بیسویں صدی فیض یاب ہوئی۔فارسی زبان کا شعر وادب جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے بعد آج بھی تخلیق ہو رہا ہے اوراتنے زرخیز پس منظر رکھنے والوں کے ہاں کتنے ایسے نام ہیں،جن پر اب پوری دنیا میں کام ہو چکا ہے۔

گیارہ صدیوں کے اس سفر میں فارسی ادب کا شاندار ماضی مسلمانوں کے لیے باعث فخر ہے اورمغربی دنیا کے لیے ایک پیغام بھی کہ ہم بھی فکری جمالیات سے عاری نہیں ہیں،بس اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔